Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کنونشن نمبر

مئی و جون 1962ء

قیمت ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون نمبر
۶۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵-بی
گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
کنونشن نمبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدل اشتراک
ہندوپاکستان سے
سالانہ - آٹھ روپے
غیر ممالک سے
سالانہ - ۱۶ شلنگ
اس پرچہ کی قیمت
ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

جلد ۱۵ | مئی - جون ۱۹۶۳ء | نمبر ۵-۶

فہرست مضامین

لمعات ———— ۲
روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن ———— (معتمد سلیمی) ———— ۹
شعلۂ بمناک ———— (محترم پرویز صاحب) ———— ۴۱
مثالی مملکت ———— (" " ") ———— ۷۵
اسلام کیا ہے؟ ———— (" ") ———— ۸۵
استقبالیہ ———— (صدر کنونشن کمیٹی) ———— ۱۰۵
رپورٹ ———— (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام) ———— ۱۱۰
بزمِ خواتین ———— ۱۱۳
حقائق و عبر ———— [بقیہ صفحہ ۱۶۷ پر] ———— ۱۳۴
مفتی محمد شفیع صاحب کے ساتھ خط و کتابت ———— ۱۳۷
بقایا رپورٹ ناظم ———— ۱۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوعِ اسلام کا زیرِ نظر شمارہ، مئی اور جون کا مشترکہ پرچہ ہے یعنی اس کے بعد ہم یکم جولائی سے پہلے اپنے قارئین سے مخاطب نہیں ہو سکیں گے۔ حالات جس رفتار سے قدم زن ہیں، ان کے پیشِ نظر اس دوران میں ملک میں اہم تبدیلیاں رونما ہو جائیں گی تشکیل پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ ایک منتخب مجلس قوانین ساز وجود میں آچکی ہوگی اور (اغلباً) اس کے اجلاس بھی شروع ہو چکے ہوں گے۔ مارشل لاء اٹھ گیا ہوگا اور ملک کا نظم و نسق عام قوانین کے مطابق سرانجام پا رہا ہوگا۔ مرکزی مجلس قوانین ساز کے علاوہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں، صوبائی اسمبلیاں بھی اپنے اجلاس منعقد کر رہی ہوں گی۔ ان (مرکزی اور صوبائی) اسمبلیوں میں، مختلف امور سے متعلق، قوانین کے مسودے زیرِ بحث ہوں گے اور ان میں سے شاید بعض مسودات، قوانین کی شکل بھی اختیار کر چکے ہوں۔ یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ اس دوران میں، اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل ہو چکی ہوگی، کیونکہ آئین کی رو سے، ایسا نظر آتا ہے کہ مجالسِ قوانین ساز کی ترتیب سے پہلے، مشاورتی کونسل کو وجود میں آجانا چاہیئے۔

۲۔ آئین کی رو سے، قوانین سازی کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ

کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا

جہاں تک اسلامی مشاورتی کونسل کا تعلق ہے، اس کا فریضہ اسی حد تک ہوگا کہ مرکزی یا صوبائی مجالسِ قوانین ساز، یا صدرِ مملکت اور گورنروں میں سے کوئی، اگر کسی مجوزہ قانون کے متعلق استصواب کرے کہ وہ قوانین

سازی کے "اصولوں" کے مطابق ہے یا نہیں، تو وہ اپنا مشورہ دے گی۔ آخری فیصلہ مجلس قانون ساز کا ہوگا۔ اور اس فیصلہ کوئی چیلنج نہیں کر سکے گا۔ مجلس قانون ساز پر اس امر کی پابندی نہیں ہوگی کہ وہ ہر مسودۂ قانون کے متعلق کونسل سے استصواب کرے۔ یا اس کے مشورہ کا بالضرور انتظار کرے۔

آئین کی اس منشاء کا منطقی نتیجہ ہے کہ مجلس قوانین ساز جو قانون بھی پاس کر دے، اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ آئین کے اصول پر پورا اترتا ہے نہ

کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا

اگر کسی کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو اس کے لئے راہ عمل یہ ہوگی کہ متعلقہ مجلس قانون ساز سے اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ کرائے۔

۲۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب تدوین آئین کا سوال زیر غور آیا تو اس سلسلہ میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ایک "علماء بورڈ" قائم کیا جائے جو اس امر کا فیصلہ کیا کرے کہ مجوزہ قانون، اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ جو مسودہ ان کے خیال کے مطابق اسلام کے خلاف ہو، اسے اسی وقت مسترد کر دیا جائے۔ اس تجویز کے خلاف اعتراض یہ تھا کہ اس صورت میں کسی مجلس قوانین ساز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ وہی تھیاکریسی ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہے، اور جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ تجویز آئینی شکل اختیار نہ کر سکی اور قوم ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گئی۔

جب دو سال اُدھر قوم سے پوچھا گیا تھا، کہ آئندہ آئین پاکستان کس قسم کا ہونا چاہیئے تو ہم نے تجویز کیا تھا کہ بہ حالات موجودہ ضروری ہے کہ اگر کسی قانون کے متعلق یہ سوال پیدا ہو کہ وہ اسلام (قرآن) کے خلاف ہے تو ہائی کورٹ اس سوال کو زیر غور لا سکے۔ اس کے بعد وہ معاملہ ملک کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے سامنے بھی جا سکے۔ عدالت میں علمائے کرام (یا دیگر ارباب علم و بصیرت) اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کریں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ اس باب میں قولِ فیصل سمجھا جائے۔

موجودہ آئین میں یہ صورت بھی اختیار نہیں کی گئی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس کی رُو سے آخری فیصلہ مجلس قانون ساز کا ہوگا، اور جب تک کسی قانون میں وہی مجلس ردوبدل نہیں کرے گی، اس کا منظور کردہ قانون ملک میں، اسلامی قانون کی حیثیت سے نافذ رہے گا۔

۳۔ طلوع اسلام کی حالیہ کنونشن کی مجلس استفسارات میں، ایک مستفسر نے پرویز صاحب سے یہ سوال پوچھا کہ اسلام کی رو سے گانا بجانا کیسا ہے؟

انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ "قرآن کی رُو سے گانا بجانا کیسا ہے" تو میں اس کا متعین جواب دے سکتا تھا لیکن مستفسر نے پوچھا ہے کہ "اسلام کی رو سے گانا بجانا کیسا ہے"۔ اس کا متعین جواب دینا مشکل ہے۔ (مثلاً) حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش کردہ اسلام کی رو سے گانا بجانا، نہ صرف جائز بلکہ جزوِ عبادت ہے۔ اور امام عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ اسلام کی رُو سے گانا بجانا حرام ہے۔ اب میں کس کے اسلام کی رو سے اس سوال کا جواب دوں؟ اس کے بعد انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ جب تک امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا، اسلام سے مراد ایک ہی منہاج اور ایک ہی مسلک تھا۔ اگر کوئی پوچھتا کہ اسلام کی رُو سے فلاں باب میں کیا حکم ہے تو ہر ایک کی طرف سے اس کا ایک ہی جواب ملتا۔ لیکن اب واقعہ یہ ہے کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کے متعلق بھی آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس باب میں "اسلام" کا یہ حکم ہے۔ آپ جو کچھ بھی کہیں گے، کسی نہ کسی فرقے کی طرف سے اس کی تردید ہو جائے گی۔ اس کے بعد صورت یہ پیدا ہو جائے گی کہ آپ کہیں گے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اسلام کے مطابق ہے۔ اور فریقِ مخالف یہ کہے گا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ اسلام کے مطابق ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں مختلف فرقوں کا وجود خود اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ بڑے بڑے معاملات تو چھوڑیئے۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کی رو سے نماز میں ہاتھ باندھنے چاہئیں یا کھلے چھوڑنے چاہئیں۔ اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس جگہ؟ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ہمارے علمائے کرام کو بہت ناگوار گذرتا ہے لیکن اب سوال گوارا یا ناگوار کا نہیں۔ اب یہ ملک کا آئینی اور عملی مسئلہ بن گیا ہے۔

پاکستان میں فی الجملہ مسلمانوں کے چار بڑے بڑے فرقے ہیں ——— شیعہ۔ اہلِ حدیث، حنفی (دیوبندی) اور حنفی (بریلوی)۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ان چاروں فرقوں کے نمائندے، مجوزہ مشاورتی کونسل کے ارکان مقرر کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد ان کے سامنے کوئی نہایت آسان سا مسئلہ رکھ دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اس کے متعلق، ایک متفق علیہ فیصلہ دیدیں (کہ اسلام کی رو سے اس کی صورت کیا ہے)۔ مثلاً یہ کہ

۱۔ اسلام کی رو سے طلاق کس طرح دینی چاہیئے۔ یا

۲۔ اسلام کی رُو سے زنا کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے اور جس معاہدہ کی رو سے مرد اور عورت کا جنسی تعلق ناجائز قرار نہیں پاتا، اس کی شرائط کیا ہیں؟

اس کے لئے کچھ مدت مقرر کر دی جائے جس کے اندر یہ حضرات، ان امور سے متعلق متفق علیہ مسودۂ قانون پیش کر دیں۔ بات واضح ہو جائے گی، اور اسی سے یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ یہ اصول کہ "کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا" نظری طور پر جس قدر سادہ اور آسان دکھائی دیتا ہے، ہمارے موجودہ معاشرہ میں جس میں ہر فرقہ

کا اسلام اپنا اپنا ہے) عملاً اسی قدر دشوار اور پیچیدہ ہے ——— جب تک پہلے یہ نہ متعین کیا جائے کہ "اسلام کیا ہے" یہ طے کرنا کہ فلاں بات اسلام کے مطابق ہے یا نہیں، ناقابلِ حل پیچیدگیاں پیدا کرنے کا موجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ہزار بار سو سالہ تاریخ میں چھوٹے چھوٹے مسائل کے متعلق بھی یہ طے نہیں پا سکا کہ ان میں سے کون اسلام کے مطابق ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے، جسے پٹنہ یونیورسٹی کے لاء کالج کے پرنسپل مسٹر ایس ایم خان صاحب نے آئینِ پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں ان الفاظ میں پیش کیا کہ

> اگرچہ آئین میں کہا گیا ہے کہ ملک کا کوئی قانون اسلامی اصولوں کے منافی نہیں ہوگا، لیکن اسلام کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ واضح "تعریف" نہ ہونے کی صورت میں مختلف لوگ اس کا مختلف مطلب لیں گے۔ کسی قانون کے اسلامی اصولوں کے منافی نہ ہونے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف لوگ اپنے نظریات کے مطابق اس کا تجزیہ کریں کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ (شہباز - ۱۹ (یا ۲۰) مارچ ۱۹۶۲ء)

اور جب کسی ملک میں کسی قانون کے متعلق مختلف لوگ تجزیہ کرنے لگ جائیں کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں، درآنحالیکہ ان میں سے ہر ایک کا اسلام کے متعلق تصور مختلف ہو تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

مسٹر خان نے آگے چل کر کہا کہ

> اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک کی شکل میں جو آئین ہمیں دیا ہے وہ ایسا آئین ہے جو گذشتہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے لئے جیتا جاگتا اور زندہ جاوید آئین ہے اور ہمیشہ دنیا کے مسلمانوں کی رہبری کرتا رہے گا۔

آگے چل کر آپ نے کہا کہ

> معاشرہ میں رائے عامہ بیدار نہ ہونے کی صورت میں[1] ایک ہی چیز مشترک ہے۔ اور وہ ہے قرآن۔ (ایضاً)

یہی وہ اصل الاصول ہے جس کی طرف ہم گذشتہ پندرہ سال سے قوم کی توجہ مبذول کراتے چلے آ رہے ہیں۔ اور

---

[1] معلوم نہیں ان الفاظ سے صاحبِ تقریر کا مطلب کیا تھا ——— غالباً یہ کہ جب تک تمام لوگ اسلام کے متعلق ایک متفق علیہ تصور نہ رکھیں اس وقت تک قدرے مشترک صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے۔

یہی ہے وہ جرم جس کی پاداش میں ہم "کافر" قرار دیئے جا رہے ہیں۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اب حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح ہوتا ہے کہ فلاں معاملہ (یا قانون) اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس میں لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ واقعات خود اس کی شہادت بہم پہنچا دیں گے۔ اگر مختلف فرقوں کے علماء کرام تمام مسلمانانِ پاکستان کے لئے متفق علیہ قوانین مرتب کر دیں تو اس سے بڑھ کر ملک کی خوش قسمتی اور ہماری مسرت اور کیا ہو سکتی ہے!

(۴) ہماری اس پریشان کن حالت کی جس میں امت (بالخصوص مسلمانانِ پاکستان) اس وقت اس بُری طرح سے مبتلا ہے اصلی وجہ ایک اور ہے۔ سابقہ اشاعت کے لمعات میں ہم نے اس کی طرف یوں ہی سرسری سا اشارہ کیا تھا۔ اب ہم اسے قدرے تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ آپ ہر محراب و منبر سے اس آواز کو سنیں گے کہ اسلام کی انفرادیت، فضیلت اور خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ اس میں مذہب اور سیاست، دین اور دنیا، چرچ اینڈ اسٹیٹ الگ الگ نہیں۔ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس میں چرچ اینڈ اسٹیٹ ایک ہی سکے کے دو رخ نہیں بلکہ وہ ایک ہی شے ہے جسے ایک طرف سے دیکھئے تو وہ چرچ ہے اور دوسری طرف سے اسٹیٹ۔ یہ آواز آپ کو صبح شام۔ چلتے پھرتے۔ اٹھتے بیٹھتے، ہر جگہ سے سنائی دے گی۔ (یہ ایک حقیقت ہے جسے واقعی ہر وقت ہمارے سامنے رہنا چاہیئے) لیکن یہ دیکھئے کہ ان الفاظ کو اس طرح دہرانے کے باوجود، ہماری عملی حالت کیا ہے؟ (مثلاً) قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اس کی عملی تعمیل نماز کی ادائیگی سے ہوتی ہے۔ نماز میں مذہب کا تو سارا پہلو موجود ہوتا ہے، لیکن سوچئے کہ اس میں سیاست کا عنصر کہاں ہوتا ہے؟ اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہے۔ اگلے دنوں ایک صاحب نے پوچھا کہ اگر اسلامی حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکس ادا کر دیئے جائیں، تو وہ زکوٰۃ کی جگہ لے لیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ "زکوٰۃ تو عبادت ہے"۔ اس میں بھی آپ دیکھئے کہ مذہب اور سیاست (چرچ اینڈ اسٹیٹ) کو کس طرح الگ الگ رکھا جاتا ہے ـــــ حالانکہ یہ جواب دینے والے وہ تھے جو سیاست کی باگیں مذہب کے ہاتھ میں دینے کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ زکوٰۃ کے بعد روزہ لیجئے اور اس میں بھی دیکھئے کہ مذہب کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے لیکن سیاست کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حج کے متعلق کسی سے کہیئے کہ یہ بین الملی کانفرنس ہے اور پھر دیکھئے کہ آپ کو ارباب مذہب کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے علاوہ دیگر مسائل پر بھی غور کیجئے جو ارباب شریعت کی تحویل میں ہیں اور دیکھئے کہ ان میں آپ کو کہیں سیاست کا شائبہ تک بھی نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے مسلمانوں میں ملوکیت آئی، سیاست مذہب سے الگ ہو گئی۔ اس کے بعد ارباب مذہب کا تعلق محض "مذہبی امور" سے رہا۔ سیاست

سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ ان کے نزدیک "دین" نام رہ گیا چند فقہی مسائل کا جن کا تعلق، یا تو عبادات سے ہے اور یا پرسنل لاز سے یعنی ان کا دائرہ "چرخ" تک محدود ہے۔ اسٹیٹ اس میں آتی ہی نہیں۔ "اسٹیٹ" کے متعلق ان کا تصور تعزیرات سے آگے نہیں بڑھتا ـــــ یعنی زنا کی یہ سزا ہونی چاہیئے۔ شراب خواری کی یہ (وغیرہ وغیرہ) یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اس وقت مثالی اسلامی حکومت شاہ سعود (حجاز) کی ہے کیونکہ اس میں شرعی تعزیرات رائج ہیں، حالانکہ جس کی نگاہ دین پر ہے وہ جانتا ہے کہ جس حکومت کی بنیاد ملوکیت پر ہو، اسے اسلامی کہنا اسلام کی اصل و بنیاد سے بے خبری کی دلیل ہے۔ بہرحال ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ان حضرات کا تعلق ہمیشہ مذہبی امور سے رہا ہے۔ اور مذہبی امور ـــــ عقائد، عبادات، پرسنل لاز ـــــ سب انفرادی ہوتے ہیں۔ ایک فرد، یا ایک فرقہ کے افراد جس طرح انھیں ادا کرتے ہیں، دیگر افراد کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ ان کی نگاہ فرد یا فرقہ سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔

ان کی تاریخ میں پہلا موقعہ ہے کہ ان کے سامنے ایک مملکت کے لئے ایسے آئین و قوانین مرتب کرنے کا مرحلہ آیا ہے جس میں "مذہب اور سیاست" ایک ہو۔ یہ ان کے لئے بالکل نئی چیز ہے، نہ یہ ان کی تعلیم میں داخل ہے۔ نہ کبھی انھوں نے ان خطوط پر سوچا ہے۔ یہ حضرات یہ تو بتا سکتے ہیں کہ ان کے فرقے کے لئے کس قسم کا قانون ہونا چاہیئے لیکن ایسا قانون مرتب کرنا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو، ان کے بس کی بات نہیں۔ آپ دیکھئے کہ انھوں نے ۱۹۵۶ء کے آئین کو اسلامی کہکر، چرا فاں کیا لیکن اس میں کونسی بات وجہ شادمانی تھی۔ یہ کہ پرسنل لاز کے سلسلے میں کتاب و سنت کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہوگی۔ اس آئین کی تنسیخ کے بعد، یہ مطالبہ بدستور رہا کہ آئین نو میں یہ تصریح ہونی چاہیئے کہ "کتاب و سنت" کے خلاف کوئی قانون ملک میں نافذ نہیں ہوگا۔ لیکن تدوینِ آئین کا مسئلہ آخری مراحل میں پہنچا تو یہ مطالبہ اس میں بدل گیا کہ ملک میں فقہ حنفی کے مطابق قوانین نافذ ہونے چاہئیں، ظاہر ہے، کہ فقہ حنفی بہرحال مسلمانوں کے ایک فرقہ کی فقہ ہے۔ اسے باقی فرقوں کے مسلمان اسلامی، یا کتاب و سنت کے مطابق تو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی نگاہ پھر ایک فرقہ کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئی۔ یہ اس لئے کہ جن بنیادوں پر یہ حضرات سوچتے ہیں ان کے مطابق ایسے قوانین مرتب کرنا جو تمام فرقوں کے مسلمانوں کے نزدیک یکساں طور پر اسلامی ہوں ممکن نہیں۔

یہ ہے وہ عملی دشواری جسے طلوعِ اسلام شروع سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ اسے نہ (خدانکردہ) کسی خاص طبقہ سے کوئی دشمنی ہے۔ نہ (پناہ بخدا) "سنت رسول اللہ" سے کوئی بغض، اور نہ ہی کسی فرقہ کی فقہ سے کوئی عداوت۔ اس کے سامنے ایک ہی سوال تھا (اور ہے)۔ اور وہ یہ کہ خدا خدا کرے ایک مملکت نے یہ

فیصلہ کیا ہے کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ اب اگر ہمارے سہو، خطا یا کوتاہ نگہی سے ایسے قوانین مرتب نہ ہو سکے جو مملکت کے تمام مسلمانوں کے نزدیک یکساں طور پر اسلامی ہوں اور اس طرح (خدانخواستہ) یہ منصوبہ ناکام رہ گیا، تو نہ صرف یہ کہ ہم غیر اسلامی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، دنیا یہ کہے گی کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ ایک مملکت کی اساس بن سکے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اس زمانے میں ممکن العمل طریق وہی ہے جسے یورپ نے اختیار کر رکھا ہے یعنی چرچ اور اسٹیٹ کو الگ الگ رکھا جائے۔" ہماری بصیرت کے مطابق اس دشوار ترین مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ مملکت کے قوانین کی اساس اُس اعلیٰ قدر کو قرار دیا جائے جو تمام فرقوں کے مسلمانوں کے نزدیک مشترک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ قدر قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں، قرآن ہر فرقہ کا ایک ہی ہے۔ سنت اور فقہ (اور اسی بنا پر اسلام) مختلف فرقوں کا الگ الگ ہے۔

بہرحال اب یہ مسئلہ نظری بحث سے آگے بڑھ کر عملی شکل اختیار کر چکا ہے اور آئندہ واقعات خود بخود اس کی شہادت بہم پہنچا دیں گے۔ جہاں تک طلوعِ اسلام کے مسلک کا تعلق ہے، یہ مملکت کے آئین قوانین کے احترام کا داعی، اور ملک میں امن قائم رکھنے کا سب سے بڑا حامی ہے۔ البتہ اسے یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ جو سوال اس کے سامنے آئے، اس کے متعلق یہ اپنی بصیرت کے مطابق، بتا دے کہ وہ قرآن کریم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ یہ اپنے اس فریضہ کو حتی الامکان ادا کرتا رہے گا۔ اور جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں اسلامی مشاورتی کونسل اور مجالس قوانین سازی کی کارروائی کو دلچسپی سے دیکھے گا۔ ہم محترم صدر پاکستان کی خدمت میں درخواست کریں گے کہ وہ مشاورتی کونسل کی تشکیل کا جلد اعلان فرما دیں۔ ہمارے نزدیک اس کا بہترین طریق یہ ہوگا کہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) مسلمانوں کے چاروں بڑے بڑے فرقوں کا ایک ایک نمائندہ لے لیا جائے۔ اگر ان نمائندگان کا تقرر انتخاب کے ذریعہ ہو تو اور بھی اچھا ہے۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ عدم گنجائش کی وجہ سے بزمِ خواتین کی اکثر تقاریر، جو کنونشن میں ہوئیں۔ نیز وہ جو کنونشن میں آئیں لیکن وہاں پڑھی نہیں گئیں ـــــ زیرِ نظر شمارہ میں شائع ہونے سے رہ گئیں، انہیں آئندہ شائع کیا جائیگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئیداد

طلوعِ اسلام کنونشن - لاہور

(چھٹا سالانہ اجتماع)

منعقدہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء

صفدر سلیمی

بادہ مستانِ حرم کے شوق و مستی کی بساط
بچھ رہی ہے پھر سحابِ نور کی آغوش میں

صدیوں کے پے در پے اور ناکام تجربوں نے نوعِ انسانی کو مایوسی اور شکست کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں لا کھڑا کیا ہے۔ ذہنِ انسانی کی مسلسل کاوشیں صحرائے نامرادی میں دم توڑ رہی ہیں۔ اور کوئی نشانِ منزل نگاہوں کے سامنے موجود نہیں۔ نوعِ انسانی نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں کے اس نازک مرحلے سے دوچار تھی اور فضائے کائنات پر مایوسیوں کا یہ اندوہناک سماں طاری تھا کہ فضاؤں میں ایک انوکھی اور دل نشیں آواز، فردوس گوش بنتی سنائی دی۔ یہ آوازِ انسانی نجات و سعادت کے اس آخری اور مکمل ضابطۂ حیات کی نقیب تھی جو چودہ سو برس قبل خالقِ کائنات اور رب العالمین کی بارگاہِ عظیم سے حضور رسالتمآبؐ کی وساطت سے انسانوں کو عطا ہوا اور اپنی عالم آرائی کے درخشندہ اور حسین تر نقوش صفحۂ ارض پر قائم کرنے کے بعد اب ریشمی غلافوں میں لپٹا پڑا تھا۔

یہ تھا تاریخِ انسانی کا وہ نازک مرحلہ جبکہ "طلوعِ اسلام" نے عراقِ دل نشیں کے اس ساز کو چھیڑا اور

کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈھلے ہوئے نغمے اس کے کالموں میں گونجنے لگے۔ گذشتہ چوبیس سال سے یہ دعوتِ انقلاب ہزاروں قلوب و اذہان میں اپنی صداقت کے نقوش قائم کرتی جا رہی ہے۔ اس کے عالم آرا مقاصد نکھر اور اُبھر کر منظرِ عام پر آ رہے ہیں اور اب نہ صرف پاکستان، بلکہ بیرونِ پاکستان میں بھی، جگہ بجگہ اسے پُرخلوص اُمنگوں اور انتہائی تڑپ اور خلش سے لبیک کہا جا رہا ہے۔

پس منظر نومبر ۱۹۵۵ء میں طلوع اسلام کنونشن کے نام سے پہلی بار اس تحریک کے ہم نوا اور اس فکر سے ہم آہنگ احباب کا اولیں اجتماع لاہور ہی میں ہوا۔ اور اس دعوتِ قرآنی کو منظم طور پر آگے بڑھانے کے لئے رابطہ اور مشاورت کی خوشگوار صورت سامنے آئی۔ اگلے سال راولپنڈی نے اس سلسلہ میں اپنے مہمانوں کی میزبانی کی اور پھر اس کے بعد لاہور کی سرزمین کو ان مسلسل سالانہ اجتماعات کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوتا چلا آیا۔ طلوع اسلام کنونشن کے اس چھٹے سالانہ اجتماع کے لئے قرعۂ فال بھی لاہور ہی کے نام پڑا اور موسم بہار کی شاداب فضاؤں میں گلبرگ کا ایک وسیع و عریض بنگلہ آراستہ و پیراستہ ہو کر قرآنی فلک کے طائرانِ ہمیشہ رس کے سالانہ اجتماع کا نشیمن قرار پا گیا۔

لاہور جسے بجا طور پر پانچ دریاؤں کی سرزمین بہار کا دھڑکتا ہوا دل کہنا چاہیئے اپنی پہنائیوں میں عظمتِ رفتہ کے کتنے ہی نقوش تابندہ اور گہرہائے درخشندہ کو سمٹائے ہوئے ہے، لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے تو اس کی دھڑکنیں نشید قرآنی کے جن زمزموں سے مالا مال چلی آ رہی ہیں اس کا اعزاز کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ اپریل ۱۹۳۸ء تک ہی خیابانِ آرزو سے اقبالؒ کا یہ نغمۂ حیات گونجتا رہا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بقرآں زیستن

اور پھر مشرق کا یہ آتش نوا فقیر یہ کہتے ہوئے ہم سے رخصت ہو گیا کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

لیکن اس نالۂ فراق کے ساتھ اس کی یہ نوید جانفزا بھی سنائی دی کہ

بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

یہ مبدا فیض کی کرم گستری کا اعجاز تھا کہ عین اس وقت جبکہ اس دانائے راز کے ماتم میں خون کے آنسو بہائے جا رہے تھے، طلوع اسلام کی نصیٰ نصیٰ کرنیں یہ نغمہ الاپتی منظرِ عام پر آ گئیں کہ

اگرچہ میکدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی وہ مے، وہ خم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے

وقت کا قافلہ رواں دواں آگے بڑھتا گیا۔ دولت پرویز - اقبال کی نواؤں کا صلہ بن کر اس کے قافلے میں لٹتی چلی گئی۔ طلوع اسلام کی پہلی کرن، اقبال کے ماتم میں سیاہ پوش ہو کر منظر اشاعت پر آئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اس کے نورِ بصیرت کی امین و پاسبان اور ترجمان بھی قرار پا گئی۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا یہ حسین و جمیل سلسلہ اپریل ۱۹۳۸ء سے فضاؤں کو تابناک بنائے چلا آ رہا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے دہلی کا دارالحکومت اس مقصد عزیز کا سرچشمہ رہا۔ حصول پاکستان کے بعد دارالحکومت کراچی کو اس کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا اور پھر ۱۹۵۸ء سے خود اقبال کے لاہور نے اپنی چشم انتظار اس کی راہ میں بچھا دی۔ اب چار سال سے لاہور نہ صرف طلوع اسلام کا مرکز اور قرآنی فکر کا سرچشمہ بلکہ مفکر قرآن کا مسکن بھی ہے۔ اس کا یہی اعزاز طلوع اسلام کنونشن کے سالانہ انعقاد کے لئے وجہ جواز بن جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ ضروری ہو گیا کہ کنونشن کے چھٹے سالانہ اجتماع کے لئے بھی نگہ انتخاب اسی کے حق میں فیصلہ کرے۔

کنونشن کی تیاریاں

نئے حالات کے نئے تقاضوں میں، اس سالانہ کنونشن سے متعلق بزمہائے طلوع اسلام پہلے سے کہیں بڑھ کر دلچسپیوں اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور منتظمین کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس مقصد کے پیش نظر ایسی جگہ تلاش کی جائے جو ان بڑھتی ہوئی ضروریات کی شایان شان کفیل ثابت ہو۔ بعد از تلاش بسیار ای/۱۲۶ (ڈی سکیم) گلبرگ کا طویل و عریض بنگلہ سامنے آیا اور مالکان نے بمسرت تمام اسے کنونشن کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ یہ بنگلہ زیر تعمیر تھا اور اس کی وسعتوں میں سامان تعمیر کے ڈھیروں کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔ سر دست عارضی ضروریات کے لئے بہت سی فوری لیکن عارضی تعمیرات کی بھی ضرورت تھی۔ پانی، بجلی اور ٹیلیفون کے کنکشن بھی اشد ضروری تھے۔ کنونشن کی تاریخیں تیزی سے قریب آ رہی تھیں اور کنونشن کمیٹی کو چند دنوں کے مختصر سے وقفے میں بڑے اہم اور ضروری انتظامات سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ مسئلہ بڑا کٹھن تھا لیکن اس کمیٹی کی قیادت میاں عبدالخالق کے ہاتھوں میں تھی اور انہیں خلیل مرزا، شیخ سراج الحق، اور انور مرزا جیسے اولوالعزم اور سرگرم رفقاء کا تعاون حاصل تھا۔ کراچی کے احباب کا ہراول دستہ بھی شیخ محمد شفیع صاحب کی قیادت میں ایک ہفتہ قبل لاہور پہنچ گیا۔ اور یہاں پہنچتے ہی وہ سب کنونشن کمیٹی کے دست و بازو بن گئے۔ نتیجہ یہ کہ گلبرگ (ڈی سکیم) کے اس ویرانے میں جہاں مواصلات تک کا کوئی ادنیٰ انتظام نہیں ان زندہ دلوں کے قہقہے گونجنے لگے۔ ہر کام تیزی اور خوش اسلوبی سے تکمیل پانے لگا۔ اور بارہ اپریل کی صبح کو جبکہ ملک کے دور دراز گوشوں سے نمایندگان کی آمد آمد شروع ہوئی، ہر شے حسن ترتیب کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی مہمانوں کے لئے چشم براہ تھی۔

احباب کا داخلہ

۱۲ اپریل کی صبح کو طلوع آفتاب کے فوراً بعد کنونشن ہاؤس میں احباب کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دور دراز کی بزموں کے نمایندے مختلف ٹرینوں اور بسوں سے سارا دن لاہور پہنچتے

رہے۔ لاہور پہنچ کر گلبرگ کے دور افتادہ ویرانوں میں کنونشن ہاؤس کو تلاش کرنا پہاڑوں سے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یہ کٹھن مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح طے ہوتا رہا۔ تلاشِ منزلِ لیلیٰ میں تھکے ماندے قیس درِ مقصود پہ پہنچ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ آتے اور کنونشن ہاؤس کی آغوشِ عاطفت خیر مقدم کہتے ہوئے انہیں اپنے دامن میں سمٹا لیتی۔ مختلف کمروں میں چارپائیوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا اور جب سورج افقِ غرب میں غائب ہو رہا تھا تو مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے مسکراہٹوں اور قہقہوں کی تازہ بستیاں آباد کر چکے تھے۔ ایوان کنونشن رنگا رنگ کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت تک اس کاروانِ شوق کے قافلہ سالار جناب پرویز بھی کنونشن ہاؤس میں پہنچ گئے تھے۔ ان کی تشریف فرمائی اور ایک ایک کمرے میں پہنچ کر ہمصفیرانِ چمن سے ان کی ہم آغوشیوں نے اس فضا کو مزید رنگینیاں اور شادابیاں بخش دیں۔ میر کارواں کی آمد! یوں سمجھئے

اک جہانِ تازہ کی صبح نمود
اک حیاتِ نو کی شامِ افتتاح

ماحول کے ویرانوں میں مسرتوں اور قہقہوں کا یہ ہجوم زبانِ حال سے یہ گیت گا گا سنائی دے رہا تھا کہ

کانٹوں کو سنبل و گل و ریحاں کریں گے ہم
ذروں کو آفتاب درخشاں کریں گے ہم
روشن کریں گے حق و صداقت کی مشعلیں
باطل کی ظلمتوں میں چراغاں کریں گے ہم

فضا مسرت بھرے قہقہوں سے گونج رہی تھی اور رات کے کھانے سے فراغت پا کر سب تعارفی اجلاس کے منتظر تھے کہ یکا یک برقی رو بھی وفورِ مسرت کے ان ہنگاموں سے متاثر ہوئی اور تاروں کو جلاتے اور شعلے برساتے ہوئے آنِ واحد میں اُس نے روشنی کا سارا نظام تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اب کمرے شبِ دیجور کی تاریکیوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ایوان کنونشن پر الگ شبِ ہجر کا سا سماں طاری تھا اور روشنی کی باز آفرینی کئی گھنٹوں تک ناممکن ہو کر رہ گئی۔ رات کا تعارفی اجلاس مجبوراً اگلی صبح پر ملتوی کرنا پڑا۔ اس سے صبح کے اجلاس کی اہمیت کافی بڑھ گئی۔

اس تعارفی اجلاس کو اب صبح کے افتتاحی اجلاس سے ہم آویز ہونا تھا اور ستاروں کی چشمکیں برملا کہہ رہی تھیں کہ

دمِ سحر انکشاف ہوگا جو فیض ہے موجِ شبنمی کا
گلوں کے دل پر کریں گے سجدے وہ پتی پتی کہ باوضو ہے

جھلملاتے ہوئے ستاروں اور اذانِ سحر کی دل کشی ۱۳ر اپریل کی صبح بہار کے نقیب بن گئے۔ احباب انگڑائیاں لے لے کر بستروں سے اُٹھ بیٹھے۔ اور تھوڑی دیر بعد قرآن کے یہ شیدائی، حافظ عبدالمجید (پنڈ دادن خاں) کی اقتدا میں صفیں باندھے کھڑے تھے اور نشیدِ قرآنی کے تاثر سے نگاہیں نمناک تھیں۔ نماز کے بعد احباب نے جلدی جلدی غسل اور ناشتہ وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ اب سب کا رُخ پنڈال کی طرف تھا اور ایوان کنونشن کے دروازے انہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

پہلا اجلاس

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شیخ محمد شفیع صاحب (کراچی) کی تحریک پر صدر کنونشن کمیٹی میاں عبدالخالق کرسیٔ صدارت پر تشریف لائے۔ حافظ عبدالمجید صاحب نے تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد محترم خلیل مرزا مائیک پر آئے۔ اقبالؒ کا پیغام

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

فضا میں ایک کیف سا برسانے لگے۔ خلیل صاحب کی جانی پہچانی اور سوز ناک آواز سے

ہوا لہلہائی فضا جاگ اٹھی
بیاباں میں بانگِ درا جاگ اٹھی

تعزیتی قراردادیں اس کے بعد یادِ رفتگاں اور تعزیتی قراردادوں کا الم آفریں مرحلہ تھا۔ سب سے پہلے محترم عزیز احمد قریشی (راولپنڈی) نے مرحوم فیروز علی بھٹی کے سانحۂ رحلت سے متعلق قرارداد پیش کی۔ اس کے بعد شیخ محمد اقبال گوجرانوالہ خان بہادر قاضی حفیظ الدین مرحوم اور ڈاکٹر رضا محمد خاں (مردان) مرحوم ڈاکٹر عبدالحنان کی یاد میں تعزیتی قراردادیں لے کر مائیک پر آئے۔ پھر مرزا علی احمد خاں (پشاور) نے ڈاکٹر یوسف علی مرحوم کی وفات پر ایک قرارداد کی صورت میں اظہارِ تعزیت کیا۔ ان مائتی قراردادوں کو پیش کرتے ہوئے محرکین نے مرحوم رفقائے سفر کی گرانقدر خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

(یہ قراردادیں روئیداد کے آخر میں موجود ہیں)

ان قراردادوں کے بعد محترم مولانا عبدالرب صاحب سٹیج پر تشریف لائے اور یہ تجویز پیش کی کہ مرنے والے احباب کے پسماندگان کی سرپرستی ہمارا فرض ہے اور ان کی ضروریات کی کفالت ہماری ذمہ داری۔ اس لئے متعلقہ بزمہائے

نمایندوں کو چاہیئے کہ ان احباب کے پسماندگان سے براہ راست رابطہ پیدا کریں اور جن معاملات میں انہیں تحریک کی خدمات کی ضرورت ہو ان کے متعلق مرکز کو اطلاع دی جائے۔ ایوان نے اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کر لی۔

سلسلۂ تعارف

مولانا عبدالرب صاحب کی اس تجویز کے بعد تعارف باہمی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بزم لاہور کے نمایندہ محترم عبداللطیف صاحب نظامی نے اپنی بزم کی طرف سے شرکیب مندوبین کے تعارف سے اس سلسلہ کا آغاز کیا۔ ان کے بعد باری باری تمام بزموں کے نمایندے اپنے اپنے رفقاء کی معیت میں ایوان کے سامنے آتے رہے۔ سب سے آخر، کراچی کی باری تھی۔ جونہی شفیع صاحب نے مائیک سے اپنے زندگی اور موت کے ساتھیوں کو پکارا، سٹیج کے دامن میں کراچی کے گرمجوش، ان تھک اور ممتاز احباب کی وہ صف آراستہ ہو گئی جن میں سے ایک ایک تحریک کے لئے گرانقدر اہمیت رکھتا تھا۔ شفیع صاحب نے بسلسلۂ تعارف پورے فخر سے بتایا کہ ان رفقائے جلیل کی مساعی جمیلہ اور ربط باہمی سے کراچی کی وسعتیں قرآنی فکر سے معمور ہو رہی ہیں۔ کراچی کے جواں ہمت بزرگ محترم مولانا عبدالرب کے تعارف کے لئے پرویز صاحب کو بنفس نفیس مائیک پر آنا پڑا اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔

> خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے مجھے مولانا سے محترم جیسا رفیق عطا فرمایا۔ آغاز تحریک سے بھی قبل کا ساتھی۔ اس دور کا ساتھی جب کوئی بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ نہ صرف میری بزم کا ساتھی بلکہ میری تنہائیوں کا ساتھی۔ دہلی کا ساتھی اور اس کے بعد کراچی اور پھر لاہور کا ساتھی۔ کس قدر خوش نصیب ہوں میں جسے ایسا ساتھی نصیب ہوا۔ اور اب تو ایک ہی آرزو ہے کہ جب میں مروں تو یہ قابل اعتماد رفیق نگاہوں کے سامنے موجود ہو تاکہ میں اپنا زندگی بھر کا سرمایۂ رفاقت اس کے سپرد کر کے اطمینان سے جان دوں اور سب کو یہ بتا سکوں کہ شخصیتوں کی موت سے تحریکوں کی موت واقع نہیں ہوتی۔

یہ کہتے ہوئے جوش تاثر سے پرویز صاحب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ ان کا گلا بھر آیا۔ وہ بڑی مشکل سے ضبط کا دامن تھامے ہوئے تھے۔

اس سلسلۂ تعارف کے بعد اجلاس چند لمحوں کے لئے برخاست ہو گیا۔ اور ٹھیک اسی سے دوبارہ شروع ہوا۔

استقبالیہ اور سالانہ رپورٹ

اجلاس کا از سر نو آغاز صدر کنونشن کمیٹی میاں عبدالخالق صاحب کے استقبالیہ اور میزان پبلیکیشنز کی رپورٹ سے ہوا۔ جس کے بعد محترم مولانا عبدالرب صاحب نے ادارہ کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔

(استقبالیہ اور رپورٹ اسی اشاعت میں شامل ہیں)

پرویز صاحب کا استقبالیہ خطاب محترم مولانا کے بعد پرویز صاحب اپنا استقبالیہ خطاب کرنے اسٹیج پر تشریف لائے۔ اس خطاب کا عنوان تھا

ساقیا! بر جگرم
شعلۂ نمناک
انداز
دگر آشوبِ قیامت بہ کفِ خاک انداز

احباب کا خیر مقدم کرتے ہوئے پرویز صاحب نے اسے سہارِ فیض کی کرم گستری سے تعبیر کیا کہ ان کی حقیری کوشش اب بے مثال کامرانیوں سے سرفراز ہے اور ان کے مخلص لیکن بے سروسامان ساتھیوں نے حالات کی ناسازگاری کے باوجود جس سعیٔ مشکور سے کام لیا ہے اس کی بدولت دعوتِ قرآنی کے چرچے یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئے ہیں۔ پرویز صاحب نے اس یقینِ کامل کا اظہار کیا کہ ان کی امیدیں اور آرزوئیں لازماً ایک حقیقتِ ثابتہ قرار پائیں گی۔ اور ایک ایک آواز اس کی تائید پر مجبور ہو جائے گی۔

تحریک کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا کہ ہم مطمئن ہیں کہ نشرواشاعت کے سلسلے میں ہمارے وسائل کی کمی مخالفین کے زورِ مخالفت سے پوری ہو رہی ہے۔ مخالفین کے بے پناہ پروپیگنڈہ نے جس تیزی سے ہمارے مقاصد کی تکمیل کی ہے وہ ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انہوں نے پورے اعتماد سے اعلان کیا کہ قرآن کی آواز کو اب روکا نہیں جا سکتا اور مخالفت کی خس وخاشاک اس کے سیلِ رواں کی روانی میں حائل نہیں ہو سکے گی۔

پرویز صاحب نے تحریک کے "نادان دوستوں" کو خاص طور پر متوجہ کیا اور ان پر واضح کیا کہ ہمارے دشمن اس تحریک کو اس نقصان کا عشرِ عشیر بھی نہیں پہنچا سکتے جو نادان دوستوں کی غیر ذمہ دارانہ روش کے ہاتھوں پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ قرآنی تحریک کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیں اور ایسی باتوں سے اجتناب کریں جو اس معاملہ میں غلط فہمیوں کا باعث ہوں۔

پرویز صاحب نے احباب پر واضح کیا کہ معاملہ قرآن کو سمجھ لینے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ سیرت و کردار کو قرآن کے سانچوں میں ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے۔ جس انقلاب کو ہم محسوس و مشہود پیکروں میں دیکھنا چاہتے ہیں آسے سب سے پہلے ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہونا چاہیئے۔

مفکرِ قرآن کا یہ خطاب قرآنی فکر کے طائرانِ ہمّت رس کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس خطاب میں انہوں نے تحریک کے ہر گوشے کو وضاحت کے ساتھ نمایندگان کے سامنے پیش کیا اور ہر نقطۂ نظر سے انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اختتام پر انہوں نے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرکے رہیں گے

(یہ خطاب شاملِ اشاعت ہے)۔

دوسرا اجلاس

کنونشن کا دوسرا اجلاس (جو ایک کھلا اجلاس تھا) چار بجے بعد دوپہر راجہ محمد اکرم صاحب ایڈووکیٹ کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں مفکرِ قرآن کا اہم خطاب ـــــ شمالی مملکت ـــــ ایوان کے سامنے آرہا تھا۔ اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعے اس کی اہمیت منظرِ اشاعت پر آچکی تھی۔ چنانچہ تلاوت کلام پاک اور خلیل مرزا صاحب کی نظم کے بعد جب پرویز صاحب مائیک کی طرف بڑھے تو ایوان کنونشن حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

پرویز صاحب کا خطاب

خطاب کا آغاز کرتے ہوئے پرویز صاحب نے، سب سے پہلے، مفکرینِ مغرب کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ وہ آج تک اپنے لئے ایسا نظام وضع نہیں کرسکا جو انسانی ضرورتوں کی کماحقہٗ بجاآوری میں کامیاب ثابت ہوا ہو۔ اس ناکامی کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی کہ آج تک جو نظامِ حکومت بھی وضع کیا گیا اس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ خود انسان تھے۔ حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں لیکن یہی روح تھی جو ہر پیکر میں کارفرما رہی۔ پرویز صاحب نے مذہبی پیشوائیت کی خون آشام ڈکٹیٹرشپ سے لے کر کمیونزم کے استبدادی ہتھکنڈوں تک ہر نظام کا تجزیہ کیا اور تفصیلاً بتایا کہ صدیوں کے ان تجربات کے نتائج ہمیشہ جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کی صورت میں سامنے آئے۔ انسانیت ان تجربوں میں خون کے دریا اور آگ کی خندقیں پیرتی اور صدیوں سے تڑپتی، پھڑکتی، کٹتی، جھلستی اور ذبح ہوتی چلی آئی۔ ان نظامہائے زندگی کے زریں نقاب الٹنے اور انہیں تار تار کرنے کے بعد پرویز صاحب اس دینِ خداوندی کی طرف آئے جو خدا اور صرف خدا کو اقتدار و اختیار کا سرچشمہ (بلاشرکتِ غیرے) قرار دیتا ہے (اور تو اور) اپنے کسی نبی تک کو بھی یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔

پرویز صاحب نے مخصوص حسین انداز سے "خدا کی حکومت" کا مفہوم واضح کیا اور بہ دلائل و براہین اور علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کی نقاب کشائی کی کہ خدا کی حکومت سے مراد ان اصولی قوانین اور مستقل اقدار کی کارفرمائی ہے جو قیامت تک کے لئے قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ یہ نظام پوری اُمت کی باہمی مشاورت سے، متذکرہ اصولی قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں اپنی جزئیات مرتب کرے گا اور اس طرح ہر دور کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا جائے گا۔ یہ سب کچھ پیش کرتے ہوئے پرویز صاحب نے قرآن کے تصورِ مملکت کی تفاصیل پیش کیں۔ (یہ خطاب بھی شاملِ اشاعت ہے)۔

تیسرا اجلاس

طلوع اسلام کنونشن کا تیسرا اجلاس ۱۳ر اپریل کی شب کو ۸½ بجے شروع ہوا۔ یہ نشست پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے لئے مخصوص تھی۔ "اولیاء اللہ کون ہیں؟" ــــ یہ تھا اس سلسلے میں ان کا موضوع خطاب اور اسکے لئے

صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کیلئے

چنانچہ موضوع کی علمی اہمیت کے پیشِ نظر اہلِ علم طبقہ کنونشن ہاؤس میں کھچا چلا آیا۔ رات کا وقت، رسل و رسائل کی نایابی، دور دراز فاصلہ، کوئی رکاوٹ بھی تو اہلِ شوق کی راہ میں حائل نہ ہوئی!

تلاوتِ کلام پاک سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ اور اس کے بعد خلیل مرزا کی آواز پنڈال میں گونجنے لگی۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مرزا صاحب سرود جانفزا کی دل کشی میں اقبالؒ کے مردِ مومن کا مقامِ چشمِ تصور کے سامنے لا رہے تھے اور جب انہوں نے کہا کہ

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

تو دلوں میں ایک حسین سا نقش ابھرنے لگا اور فضا جھوم اٹھی۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن

کیف و مستی کے اس وجد آفریں ماحول میں پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس سوال کی اہمیت واضح کی کہ ــــ

اولیاء اللہ کون ہیں؟ اور پھر بتایا کہ ہمارے ہاں یہ تصور چلا آرہا ہے کہ یہ ایک الگ گروہ ہے۔ ان کی خصوصیات بھی جماعت مومنین سے الگ قسم کی ہوتی ہیں — زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی۔ اس تصور کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلے میں اگر تحقیق سے کام لیجئے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ تصور اسلامی ہے نہیں بلکہ باہر سے آیا ہے۔ اس کے اجزا میں کوئی عنصر یہودیوں کا، کوئی مجوسیوں کا، کوئی یونانیوں کا اور (بالخصوص) کوئی ہندی ویدانت کا نظر آئے گا۔ پرویز صاحب نے پھر یہ ساری تفصیل اس ایک شعر میں سمٹا دی کہ

آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری
ان کی تصویر میں، پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

اس کے بعد پرویز صاحب نے اَلْوَلِیُّ کا قرآنی مفہوم پیش کیا اور پھر واضح کیا کہ قرآن کی رُو سے خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔ خدا نے پہلے کائنات کی تخلیق کی اور پھر اختیار و ارادہ کی صفات عالیہ سے سرفراز کر کے انسان کو پیدا کیا۔ اور یہ انسان کی مذرت کاریاں ہیں جن کے باعث وہ حسن کائنات کی تکمیل میں خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ لاریب کہ اس رابطہ میں انسان کی حیثیت رفیق ادنیٰ کی ہوتی ہے اور خدا کی حیثیت رفیق اعلیٰ کی۔ پرویز صاحب نے قرآن کی مختلف آیات پیش کیں اور ان کی روشنی میں بتایا کہ وَلِیّ کا لفظ خدا نے اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے اور مومنین کے لئے بھی۔ خدا، ولی بمعنی حاکم اور سرپرست کے ہوتا ہے۔ اور انسان ولی ہوتا ہے رفیق ادنیٰ کے معنوں میں۔ جب خدا اپنے حق حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا اور اسے گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سوا کسی دوسرے کو بھی وَلی تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پرویز صاحب نے واضح کیا کہ کوئی انسان جب دوسروں کو ولی تسلیم کرتا ہے تو (بالفاظ دگر) وہ اسے خدا کے حق حکومت میں شریک کر لیتا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت جائز نہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کی اطاعت میں خدا کی اطاعت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اس کا خوف ہر وقت ذہن پر مستولی رہتا ہے۔ وہ اسے ہر لمحہ حاضر و ناظر اور عالم الغیب سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے لرزنے لگ جاتا ہے اور معافیاں مانگتا ہے — یہ حیثیت وہ خدا کو بھی نہیں دیتا۔

پرویز صاحب نے "خدا کی اطاعت" کا مفہوم واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اطاعت اب صرف کتاب اللہ کی رو سے ہوگی لیکن اس دنیا میں، خدا کی کتاب کے خلاف بھی ان حضرات کی اطاعت ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر فخریہ طور پر کہا جاتا ہے کہ

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

پرویز صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ قرآن خدا سے انسان کا براہ راست اور بلا واسطہ تعلق پیدا کرنے آیا ہے۔ یہ تعلق خدا کی اسی آخری کتاب کی وساطت سے پیدا ہوتا ہے اور اگر خدا اور انسانوں کے درمیان کوئی اور واسطہ رکھنا مقصود ہوتا تو ختم نبوت کے اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب کچھ ٹھوس اور زندہ جاوید حقائق کی بنا پر ہوتا ہے لیکن تصوف میں حقائق کا گزر ہی نہیں بلکہ لطائف سے کام لیا جاتا ہے اس کی تمثیلات نری شاعری ہوتی ہیں جن کے پس پردہ کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

یہ تفصیل پیش کرتے ہوئے مفکر قرآن نے قرآنی آیات کی روشنی میں بتایا کہ ہر مومن خدا کا ولی ہوتا ہے اور اس میں کسی گروہ کی تخصیص نہیں۔ اولیاء اللہ کے بارے میں مروجہ عقائد اور تصورات ایک قوم کے زوال اور شکست کے دور کی نشانیاں ہیں۔ یہ اس دور کی باتیں ہیں جب قوم پر مایوسیاں چھا جاتی ہیں، جب قوائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں۔ جب نہ نظام باقی رہتا ہے جس کا سہارا پکڑا جا سکے اور نہ قوتِ عمل رہتی ہے جس سے زندگی کی راہوں کو ہموار کیا جا سکے۔ زندہ قومیں خود اپنی قوتِ عمل سے خدا کی تقدیر بنتی ہیں اور نت نئے معجزے دکھاتی ہیں۔

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

غرضیکہ انہوں نے اس خطاب میں "طریقت اور معرفت" کے متعلق مروجہ غلط تصورات کو قرآن کریم کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا۔

چوتھا اجلاس

۱۴ اپریل کی صبح بزمہائے طلوع اسلام کے مندوبین کے خصوصی اجلاس کی صبح تھی۔ اور اس میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت سے متعلق بڑے اہم ریزولیشنز سامنے آ رہے تھے۔ محترم مولانا عبد الرب صاحب کی صدارت میں ۹ بجے صبح یہ اجلاس شروع ہوا۔ حافظ عبد المجید صاحب نے تلاوت کلام پاک سے کارروائی کا آغاز کیا۔ اور خلیل مرزا

پہلی قرارداد صاحب کی نظم کے بعد کرسی صدارت کی طرف سے مولانائے محترم اس فتوائے کفر سے متعلق

قرارداد لے کر مائیک کے سامنے آئے جو گذشتہ ماہ مولوی صاحبان کی طرف سے پرویز صاحب اور ان کے ہم خیال رفقاء کے خلاف شائع ہوا تھا۔ (قرارداد روئیداد کے آخر میں دیکھئے)

قرارداد کو پیش کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ شائع کرتے ہوئے ان حضرات نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی یہ اشتعال انگیز حرکت ملک کے امن کو کس قدر نقصان پہنچا سکتی ہے۔ جیسا کہ مدتوں سے ان حضرات کا شعار چلا آرہا ہے، انہوں نے اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے پرویز صاحب کی تحریروں سے چند فقرے اکٹھے کئے اور انہیں ان کے ماقبل اور مابعد سے الگ کر کے ایک فتویٰ شائع کر دیا۔ انہوں نے قطعاً اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کہنے والا اپنی پوری تحریر میں کیا پیش کر رہا ہے اور سلسلہ تحریر کا جو باہمی ربط توڑ اگیا ہے اس سے مفہوم کس قدر بدل جاتا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ہم نے کنونشن میں احباب کی داستانیں سنی ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ اگر یہ لوگ بھی ان اشتعال انگیزیوں کا منہ توڑ جواب دینے پر اتر آتے تو ملک میں کیسی تشویشناک صورت پیدا ہو جاتی۔ لیکن میں ان تمام احباب کو جن پر اس فتویٰ کی زد پڑی ہے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے سکون اور ضبط کو قائم رکھا۔ لیکن میں اسے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی اشتعال انگیزیوں کا انسداد کیا جائے۔ احباب کا ضبط قابل مبارکباد ہے لیکن اگر مخالفین کی ان حرکتوں کو فی الفور روکا نہ گیا تو ہو سکتا ہے کہ ضبط کا بند کسی وقت ٹوٹ جائے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایسی صورت حال سامنے آئے۔ بزم لاہور کے نمایندے محترم عبداللطیف نظامی نے اس قرارداد کی تائید کی۔ ان کے بعد بزم کراچی کے نمائندہ محترم شفیع صاحب مائیک کے سامنے آئے۔ قرارداد کی تائید کرتے ہوئے انہوں نے پورے اعتماد سے اعلان کیا کہ جہاں تک کراچی کا تعلق ہے وہاں دعوت قرآنی کے ترجمان اس قدر مضبوط ہیں کہ مخالفین کو یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ اس قسم کی اشتعال انگیز حرکتوں سے کام لیں۔ چنانچہ کراچی سے شائع ہونے کے باوجود کسی شہری کو اس فتویٰ کی شکل تک نہیں دکھائی گئی۔ مزید برآں اس قسم کی حرکتیں کم علم طبقہ کو ہی متاثر کرتی ہیں اور کراچی جیسے مرکز میں، جہاں شہریوں کی علمی و فکری سطح بلند واقع ہوئی ہے اور طلوع اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت نے وہاں ایک روشنی سی پھیلا دی ہے، ایسی حرکات ویسے ہی مضحکہ خیز قرار پاتی ہیں۔

حافظ برکت اللہ صاحب (کراچی) نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ سوال لازماً سامنے آئے گا کہ آخر ان خود ساختہ کافر گروں کو یہ حق کس نے عطا کیا ہے کہ وہ دوسروں کے کفر و ایمان کے فیصلے کریں۔ پرویز صاحب کی یہ کتابیں جب سالہا سال سے موجود ہیں تو اب یکایک اس قسم کا فتنہ کیوں پیدا کیا گیا۔ یہ فتویٰ خالصتہً ایک سیاسی سٹنٹ ہے اور حکومت کو سوچنا پڑے گا کہ اس کے محرکات کیا ہیں؟ ہمارے لئے بہرحال یہ ایک آزمائش ہے اور

اس آزمائش میں ہمارے ایمان تروتازہ ہوگئے ہیں اور اب ہم قرآن کی آواز کو پہلے سے بڑھ چڑھ کر پھیلانے کے قابل ہیں۔ کراچی کے ہفتہ وار درس قرآنی کی حاضری پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے اور طلوع اسلام کے مسلک و مقصد کے سمجھنے کے لئے لوگوں کی دلچسپیاں بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔

میاں عبدالخالق (صدر کنونشن کمیٹی) نے ایوان کو ایک اہم نکتہ پر متوجہ کیا اور وہ یہ کہ نئے آئین کی رُو سے صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اور جب ہر فرقے نے دوسرے فرقے کو کافر قرار دے رکھا ہے اور اپنے اس کھیل کو جاری رکھتے ہوئے مولوی صاحبان نے کسی وقت صدر مملکت پر بھی اسی قسم کا فتویٰ صادر کر دیا تو صورت حال کیا ہوگی۔

محترم محمد اسلام (کراچی) نے کہا کہ مارشل لا کے واضح ضابطے موجود ہیں جن کی رو سے مذہبی اشتعال اور منافرت پھیلانا ایک سنگین جرم قرار پاتا ہے لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑے گا کہ اس ضابطہ کے باوجود ان کافر گروں کو اشتعال انگیزی کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے اور حکومت نے ابھی تک اس ضمن میں کوئی موثر اقدام نہیں کیا۔ بعض دیگر نمایندوں کی تائید کے بعد قرارداد کو بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔

(قرارداد آخر میں دیکھئے)

دوسری قرارداد

مذکورہ قرارداد کی منظوری کے بعد قرآنی تعلیم کی ضرورت سے متعلق ایک دوسری قرارداد کرسیٔ صدارت کی طرف سے ایوان کے سامنے لائی گئی۔ قرارداد کو پیش کرتے ہوئے مولانا عبدالرب نے فرمایا کہ آئین کی رو سے قرآنی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی تعلیم اور اسلامیات ہوں گی کیا؟ کیونکہ مروجہ نصاب قطعاً اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ قرآنی نصاب کی ترتیب و تدوین میں طلباء کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ چھوٹے بچے قرآن کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو انہیں قرآن اور اس کی تعلیمات سے مانوس کر سکے۔ قرآن کی پیش کردہ کہانیاں ان کے نصاب میں شامل ہوں اور جوں جوں ان کے ذہن نشوونما پاتے جائیں قرآنی تعلیم کی ارتقائی سطح بتدریج ان کے سامنے آتی جائے۔

قرارداد کی تائید کرتے ہوئے شیخ غلام نبی صاحب (لیہ) نے فرمایا کہ جس قدر عظیم الشان تعمیر مقصود ہو اس کی بنیاد اسی قدر مضبوط اور مستحکم ہونی چاہیئے۔ قوم کے شاہین بچے اس کے ایوان حیات کی اساس ہوتے ہیں اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت ایوانِ ملی کی عظمت و استحکام کی ضمانت ہوگی۔ جب قرآنی تعلیم کی اہمیت کو آئین میں تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس مقصد کی بجاآوری کے لئے ادارۂ طلوع اسلام سے بڑھ کر موزوں ادارہ اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اسے لازماً حکومت کی طرف اس سلسلے میں دست تعاون بڑھانا ہوگا۔

حاجی خیر محمد صاحب پراچہ، حافظ برکت اللہ صاحب، چوہدری فیروز الدین صاحب، اسلام صاحب۔ نظامی صاحب

اور شفیع صاحب نے اپنی تائیدی تقاریر میں ان امکانات کا جائزہ لیا جو اس مقصد کی بجا آوری کے لئے ادارہ کے سامنے آئیں گے۔

کافی غور و خوض کے بعد اس قرارداد کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ اور مولانا عبدالرب صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس فیصلہ پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا کہ جس مقصد عظیم کے لئے ادارہ وجود میں آیا تھا آج آپ نے اس کا سنگ بنیاد رکھ دیا ہے۔ یہ میرے زندگی بھر کے سہانے خوابوں کی خوش آیند تعبیر ہے۔

(قرارداد آخر میں ملاحظہ ہو)

تیسری قرارداد کرسیٔ صدارت کی طرف سے ایک اور قرارداد مولانا نے پیش کی۔ اس قرارداد کے ذریعے بزموں کو ہدایت کی گئی کہ تحریک کے مخالف طبقہ کی جامد مذہبی ذہنیت کے خلاف علیحدگی کی روش اختیار کرنے کی بجائے ان سے اخوت اور ہمدردی کا سلسلہ قائم رکھا جائے اور ان کی مخالفت کے جواب میں موعظۃ الحسنۃ سے کام لیا جائے۔

محترم عزیز احمد صاحب قریشی (نمایندہ بزم راولپنڈی) اور خورشید علی خاں صاحب (کراچی) کی تائید سے یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

چوتھی قرارداد شیخ محمد شفیع صاحب (کراچی) نے یہ قرارداد پیش کی کہ اب جبکہ ادارہ کی نگرانی میں بزموں کا کام خوش اسلوبی سے جاری ہے، مجلس عاملہ کے قیام سے متعلق فیصلہ کو منسوخ قرار دیا جائے۔

مرزا علی احمد خاں (پشاور) نے اس قرارداد کی مخالفت کی۔ لیکن حافظ برکت اللہ صاحب (کراچی) کی تائید کے بعد ایوان نے اس قرارداد کو بالاتفاق منظور کر لیا۔

پانچویں قرارداد محمد اسلام صاحب (کراچی) نے ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا کہ آیندہ سالانہ کنونشن کا ایجنڈہ بزموں کو قبل از وقت بھیجا جائے تاکہ شریک ہونے والے نمایندے ان کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو کما حقہٗ پیش کرنے کے قابل ہو سکیں۔

اس قرارداد سے متعلق ایک جزوی قرارداد پیش کرتے ہوئے حافظ برکت اللہ صاحب نے یہ ضرورت واضح کی کہ سالانہ کنونشن کی تجاویز کا سب کنونشن میں جائزہ لینے کے بعد اگر نئی تجاویز سامنے آئیں تو انہیں منظوری کے لئے آیندہ سالانہ کنونشن میں پیش کیا جائے۔ یہ قراردادیں بھی ایوان نے منظور کر لیں اور اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ایک سب کنونشن راولپنڈی اور دوسری لائل پور میں منعقد کی جائے۔

اجلاس کا اختتام قریب تھا کہ پرویز صاحب کو ایک بار پھر مائیک پر آنا پڑا۔ اگلا اجلاس ان کی طاہرہ بیٹیوں کا اجلاس تھا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے چند امور کی وضاحت ضروری سمجھی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک عرصہ سے تحریک کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ قرآنی فکر کی جس روشنی سے گلی کوچوں میں ایک رونق سی آرہی ہے گھروں کی چار دیواریاں بھی اس سے منور ہونی چاہئیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر طاہرہ بیٹیوں نے گھروں سے کام شروع کیا اور تھوڑی سی مدت میں وہ سلیم بیٹیوں کو مات کر گئیں۔ ان کی شبانہ روز کاوشوں سے قرآن کی روشنی گھروں میں تیزی سے پھیلنے لگی۔ چنانچہ پچھلی کنونشن میں انہوں نے اپنے خطابات سے جو گہرے اثرات چھوڑے وہ ہمیشہ رہیں گے۔ آپ کی یہی قرآنی بہنیں اور قرآنی بیٹیاں اگلے اجلاس میں آرہی ہیں۔ اس اجلاس میں اپنی ان بہنوں اور بیٹیوں سے متعلق آپ پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان کے احترام اور وقار کو انتہائی سنجیدگی سے قائم رکھئے اور اسے نہ بھولئے کہ جو قوم اپنی بہو بیٹیوں کا احترام نہیں کر سکتی وہ بہت جلد صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے۔ پرویز صاحب کی آواز یہ سب کچھ کہتے ہوئے تھرتھرا رہی تھی۔ احباب کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے اور نگاہیں برملا کہہ رہی تھیں کہ اپنی طاہرہ بیٹیوں اور بہنوں سے متعلق ہم اپنی ذمہ داریوں سے نہ پہلے کبھی غافل ہوئے ہیں اور نہ آئندہ ایسا ہوگا۔

پانچواں اجلاس

؎ مرغِ چمن! ہے یہی تیری نواؤں کا صلہ

سہ پہر کے تین بج رہے تھے اور کنونشن کمیٹی کی نگرانی میں رضاکار ایوان کی نشستوں کو ایک نئی ترتیب دے رہے تھے۔ ان کی طاہرہ بہنیں اس اجلاس کو خطاب کرنے آرہی تھیں اور موقع کی مناسبت سے نشستوں کی ترتیب نو ضروری قرار پا گئی تھی۔ ایوان کے اگلے حصے اور سٹیج کے بازوؤں میں خواتین کی نشستوں کو مخصوص کیا جا رہا تھا۔ ان سے ملحقہ خواتین کے جداگانہ پردہ دار حصے کو بھی کافی وسیع کیا گیا۔ خواتین کے داخلہ کے لئے نئے دروازے بنا دیئے گئے۔ اور جب حسبِ اعلان ان کی آمد شروع ہوئی تو پورا ایوان ایک نئے نقشے کے مطابق ترتیب پا چکا تھا۔ اجلاس کا انتظام طاہرہ بہنیں اپنے ہاتھوں میں لے چکی تھیں اور حسبِ ضرورت انہوں نے اس میں کچھ مزید تبدیلیاں بھی کر لی تھیں۔

اجلاس کا افتتاح پرویز صاحب کے مختصر لیکن بصیرت افروز خطاب سے ہوا۔ حرفِ آغاز کے طور پر انہوں نے

فرمایا کہ قرآن جہاں انسانی دنیا میں بہت سے عظیم آفریں انقلاب لایا وہاں ایک اہم انقلاب یہ بھی تھا کہ اس نے دنیا کو عورت کے حقیقی مقام سے روشناس کیا۔ اور اعلان کیا کہ اگر امت کی اصلاح و ارتقاء چاہتے ہو تو امت کی ماؤں کے قلب و نگاہ اور آغوش تربیت میں انقلاب پیدا کرو۔ کیونکہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہی ماں ہے جو

سیرتِ اقوام را صورت گر است

اور

از امومت پختہ تر تعبیر ما
در خط سیمائے او تقدیر ما

میری ان بیٹیوں میں سے بیشتر وہ ہیں جنہوں نے براہ راست مجھ سے قرآنی تعلیم حاصل کی۔ بعض نے میرے لٹریچر سے قرآنی فکر کو سمجھا۔ اب اگر یہ گھروں کی چار دیواری میں چراغ خانہ ہیں تو درسگاہوں میں قرآنی دعوت و فکر کی مبلغ۔ آنے والی نسلیں ان کی شبانہ روز کاوشوں کی بدولت قرآن کی روشنی میں پروان چڑھیں گی۔ ہم ان بہنوں اور بیٹیوں کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے پہلے اس فکر کو خود اپنایا اور اب اسے دیوانہ وار اسلامی گھرانوں میں پھیلاتی چلی جا رہی ہیں۔

ٹھیک ساڑھے تین بجے محترمہ بہن حمید جہاں خواجہ کی صدارت میں اس یادگار اجلاس کا آغاز ہوا۔ پنڈال کے مخصوص حصے پہلے ہی خواتین سے کھچا کھچ بھر گئے تھے اور اب ان کے لئے مزید نشستوں کا انتظام رضاکاروں کے لئے ایک کٹھن سی مہم بنتا جا رہا تھا۔ کنونشن کمیٹی بہرحال خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو رہی تھی۔

محترمہ بہن ثریا عندلیب نے رسال گزشتہ کی طرح تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا آغاز کیا۔ عزیزہ بیٹی ثوبیہ اور روبینہ نے مل کر ایک نظم پڑھی۔ اور اس کے بعد ننھی بچیاں ـــــ روبینہ، عفت آرا، سلمیٰ، نجمہ۔ زینت ـــــ باری باری سٹیج پر آئیں اور اپنے مختصر خطابات پیش کئے۔ ان خطابات میں سنجیدگی، خلوص اور وقار طنز و مزاح کا دل نشین امتزاج اپنی شگفتگی سے دلوں کی گہرائیوں تک اثر انداز ہو رہا تھا۔ بھولے بھالے معصومانہ انداز میں عزیز بچیاں بڑے اثر انگیز قرآنی نکات سامنے لا رہی تھیں۔ ایوان کے طول و عرض میں کبھی مسکراہٹوں کے غنچے کھلکھلا اٹھتے اور کبھی اپنی ہی داستانِ غم کی کوئی حسرتناک تصویر نگاہوں کے سامنے ابھر آتی اور آہوں کا سماں بندھ جاتا۔

ننھی طاہرہ بیٹیوں کا سلسلہ خطابات ختم ہوا اور پردے کی اوٹ سے لرزتی ہوئی ایک آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی ـــــ ایک اثر آفریں آواز جو معاشرے کی زخم خوردہ گہرائیوں میں جھانک رہی تھی اور غربت و افلاس کے آنسوؤں کو اپنی لرزشوں میں سمائے دلوں کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ یہ پرویز صاحب کی عزیز

طاہرہ بیٹی ڈاکٹر زاہدہ درانی کی آواز تھی جو "دولت کی پیدا کردہ بیماریاں" کا موضوع لے کر آئی تھیں۔ سیدھے سادے الفاظ کی پہنائیوں میں غربا کی بے بسی کے آنسو اور امراء کی فراوانیٔ دولت کے قہقہے آپس میں ٹکرا رہے تھے اور زاہدہ بہن ایک معالج (ڈاکٹر) کے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس نقاب کو الٹ رہی تھیں جس نے اکثر لوگوں کو خود فریبی اور خوش فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کا علاج (علیٰ وجہ البصیرت) تجویز کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان اعصابی مریضوں کو ان کے گم گشتہ مقصودِ حیات سے روشناس کرانا اشد ضروری ہے اور یہ متاعِ گراں بہا قرآن کی بارگاہِ عظیم کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔

ڈاکٹر زاہدہ کے بعد پروفیسر شمیم انور صاحبہ کی باری تھی۔ حسبِ سابق وہ اب کی بار بھی انگریزی میں خطاب کر رہی تھیں۔ اور ان کے خطاب کا موضوع تھا "پاکستان کا کلچر" (CULTURE OF PAKISTAN)۔ شمیم انور، پرویز صاحب کی ایک عزیز ترین بیٹی ہے جس کی قرآنی فکر سے وابستگی ایک جنون کی سی کیفیت لئے ہوئے ہے اور اس کی نشر و اشاعت کی والہانہ امنگیں اور آرزوئیں اس کے لئے زندگی کا منتہا و مقصود قرار پا گئی ہیں۔ وہ سر جھکائے مائیک کی جانب بڑھیں اور ایک لمحہ بعد انگریزی کے بچے تلے لب و لہجہ میں پاکستانی کلچر کی تفاصیل منظرِ عام پر آنے لگیں۔ مطالبۂ پاکستان کا پس منظر کیا تھا؟ ہماری حیاتِ ملی کا نصب العین کیا ہے؟ فاضل طاہرہ بہن نے، ہمارے تاریخی پس منظر کی روشنی میں، ان سوالات کا جواب پوری وضاحت سے پیش کیا اور بتایا کہ قرآن نے جو مستقل اقدارِ حیات عطا کی ہیں ان کی خاطر جینا اور مرنا اہلِ ایمان کا منتہا و مقصود ہے۔ اور اسی کے برگ و بار ہیں جن کے ربطِ باہمی سے ہمارا کلچر ترتیب پاتا ہے۔ اسی کی بقا و استحکام کیلئے ہم نے یہ خطۂ زمین حاصل کیا اور یاد رکھئے کہ یہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے کھنڈرات سے نہیں ملے گا بلکہ بدر و حنین کے میدان اس کی نشاندہی کریں گے۔

اب ——— "جنت کی حوریں" ——— ایک نیا موضوع ایوان کے سامنے تھا۔ بڑا انوکھا اور بصیرت آفریں موضوع۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی قابلِ فخر بیٹی محترمہ بہن ثریا عندلیب کو اس موضوع پر خطاب کرنا تھا۔ ثریا عندلیب پرویز صاحب کی گرانقدر طاہرہ بیٹی جس کی زندگی سراپا قرآنی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آئے گی، قرآنی تحریک کا بیش بہا سرمایہ ہیں اور ان کا ہر خطاب قرآن کی کرنوں سے مستنیر ہوتا ہے۔ اس خطاب میں بھی انہوں نے آیاتِ قرآنی کی تنویروں سے کام لیا۔ وہ بتا رہی تھیں (اور علیٰ وجہ البصیرت بتا رہی تھیں) کہ جنت کی جن حوروں کی نوید قرآن میں دی گئی ہے وہ کسی اور جہان کی "حوریں" نہیں بلکہ اسی جہانِ رنگ و بو کی مومن عورتیں ہیں۔ اور یہ نقشہ اس معاشرے میں بے نقاب نظر آئے گا جو خدا کے قوانین پر متشکل ہوگا۔ قرآنی معاشرہ کے ایمان و عمل کی شاہراہ پر یہ "حوریں" مومنین کے دوش بدوش چلتی نظر آئیں گی ——— اس دنیا میں بھی اور بعد کی زندگی میں بھی۔

صدر اجلاس محترمہ حمید جہاں خواجہ — ہماری تعلیم قرآن کی روشنی میں — کے موضوع پر اپنا مقالہ لے کر مائیک پر آئیں۔ اپنے مقالہ کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ہم ایک مدت تک غیروں کی غلامی میں رہے۔ حاکم قوم کی اطاعت اُس دور میں پہلا سبق تھا۔ اسی اطاعت کو ترقی اور اعزاز کی سند قرار دیا جاتا تھا۔ اساتذہ دل و دماغ کا آزادانہ استعمال نہیں جانتے تھے۔ اس نظام تعلیم کی مثال ایک فیکٹری کی سی تھی جہاں مالک کی مرضی سے مال تیار ہوتا تھا۔ اس دور میں ہم خود نگہی اور خودگری کے اوصاف سے محروم تھے اور تعلیم کا حقیقی مقصد فوت ہو چکا تھا۔ آج ہم آزاد ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہماری کوششیں اب بھی یہی ہیں کہ مغرب کے ماہرینِ تعلیم آئیں اور ہمارا نظامِ تعلیم مرتب کریں۔ وہ ہم سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے مقاصدِ حیات کیا ہیں اور معاشرے کی تفاصیل کیا۔ لیکن ہم انہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتے اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ حسبِ منشا ہمارے تعلیمی نظام کے ضوابط مرتب کر جاتے ہیں۔ مدتوں کی غلامی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم علم و فکر اور بصیرت میں پیچھے رہ گئے اور تحقیق سے منہ موڑ لیا۔

محترمہ خواجہ بہن اس پس منظر کو لئے ہوئے آگے بڑھیں اور فرمایا کہ اب ہم آزاد ہیں اور قرآنی معاشرہ ہمارا نصب العین۔ اب ہم نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھنا ہے۔ یاد رکھئے کہ قرآن کسی معاملہ میں بھی سطحی علم کو سند قرار نہیں دیتا بلکہ علم کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے پوری راہ نمائی دیتا ہے اور انہیں عام کرنے کا داعی ہے۔ انسانی زندگی کے مقاصد کیا ہیں اور قرآنی معاشرہ کے اصول و تفاصیل کیا۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں متعین ہوگا۔ اس کے لئے علمی مجالس قائم کرنی ہوں گی۔ اور معیاری نصابِ تعلیم مرتب کرنا ہوگا۔

اس کے بعد پروفیسر زاہدہ منظور آئیں، حسبِ سابق (اور حسبِ طبع) الفاظ کی بے ساختگی میں تلخ حقائق کے نشتر سموئے ہوئے۔ "عورتوں کا مسئلہ" ان کے مقالہ کا عنوان تھا اور اس عنوان سے انہوں نے پاکستان کے بے شمار مسائل کے ساتھ ایک اور اہم مسئلے کی وابستگی قائم کر دی۔ ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل میں "عورتوں کے مسئلے" کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اور یہ اہم مسئلہ جب عزیزہ بہن زاہدہ منظور کے قلم کی زد میں آئے گا تو پھر اندازہ لگائیے کہ جس طاہرہ بیٹی نے اپنے معاشرہ کے گہرے زخموں کی ٹیسیں دل کی گہرائیوں تک محسوس کی ہو وہ ان پر سے مکر و فریب کے پردے اُلٹنے میں ہچکچاہٹ کیونکر محسوس کرے گی۔ چنانچہ اس نے صاف اور واشگاف الفاظ میں کہا کہ جس معاشرے کا نصف حصہ ذہنی طور پر مفلوج ہو اس کی ترقی کے خواب ایک سرابِ محض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معاشرے کی نشوونما ارتقا کے لئے، عورت کے دل و دماغ میں چھپے ہوئے صدیوں کے نقوش غلامی و محکومی کو مٹانا ہوگا اور ان غلط تصورات کی جڑ کاٹنی پڑے گی جو مدتوں سے اس کے جذبات و حسیات سے لپٹے ہوئے ہیں۔ عورت کی شکست خوردہ ذہنیت غلط روایات کی پروردہ ہے۔ یہ نقوش صدیوں میں بہت گہرے ہو چکے ہیں۔ تعلیمی ادارے انہیں نہیں مٹا سکتے

کیونکہ وہ خود اسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ عزیزہ بہن زاہدہ منظور نے کم ظرفی کے اس مظاہرے کا ماتم کیا جو بنیادی جمہوریتوں کے کونشن (منعقدہ لاہور) میں مردوں نے عورتوں کے حقوق کے خلاف روا رکھا۔ انہوں نے کہا کہ اس کنونشن میں عائلی قوانین کے خلاف بڑے شد و مد سے یہ دلیل پیش کی گئی تھی کہ "علماء" انہیں خلاف اسلام سمجھتے ہیں۔ زاہدہ بہن نے یہ کہتے ہوئے ایک حقیقت آفریں گہری طنز سے کام لیا اور کہا ہزاروں بہو بیٹیوں کو ہندوؤں سکھوں کے سپرد کر کے سہاگ آنا شاید ان حضرات کے نزدیک اسلام کے خلاف نہ تھا۔ آخر یہ زبانیں جو ان عائلی قوانین کے خلاف تلوار کی طرح چلتی ہیں اس حادثہ الیمہ پر کیوں مہر بہ لب رہیں؟ انہوں نے کہا کہ روایتی تصورات کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آنے ہی سے عورت کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

پروفیسر زاہدہ منظور کے بعد ڈاکٹر مریم خان صاحبہ کی باری آئی۔ "جغرافیہ اور قرآن پاک" ان کے مقالہ کا عنوان تھا۔ بہن مریم خان صاحبہ پہلی بار طلوع اسلام کنونشن کی سٹیج پر آ رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنے موضوع کے اعتبار سے جو کچھ پیش کیا وہ بڑا علم افروز اور فکر انگیز تھا۔ قرآن کی روشنی میں انہوں نے جغرافیہ کی اہمیت واضح کی۔ سِیرُوا فِی الْاَرْضِ کے قرآنی محاکمہ کی حکمتِ بالغہ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ قوموں کی زندگی میں جغرافیہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قرنِ اول کے مسلمانوں نے اسے کس طرح نشانِ منزل کی حیثیت دی تھی اور اس کی وساطت سے زندگی کی بلند و بالا حقیقتوں کی شناسائی میں کس قدر امداد ملی۔

عزیزہ بہن بیگم سکندرہ ریاض کے مقالہ کا موضوع تھا ـــ گھروں کا امن گھروں کی سلامتی ـــ عائلی زندگی کی تفاصیل پیش کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ گھروں کا امن۔ گھروں کی سلامتی ان کے مکینوں کی وحدت فکر و نگاہ پر منحصر ہے۔ جب تک اس فضا میں ہم آہنگی اور یکرنگی کے امکانات نہیں ابھریں گے ہمارے گھر جہنمی کیفیت کے آئینہ دار رہیں گے۔ انہوں نے اپنی بعض طاہرہ بہنوں کے تاثرات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لئے اپنے آپ کو مظلوم اور بے بس سمجھنا کسی طرح روا نہیں۔ اور جب قوموں کی تقدیر ہمارے ہاتھوں میں ہو تو ہم مظلوم کیونکر قرار پا سکتی ہیں۔ یاد رکھئے کہ معاشرہ، گھروں ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور گھروں کی اصلاح کی ذمہ داری عورت پہ عائد ہوتی ہے اور وہی اسے بہ حسن و کمال سرانجام دے سکتی ہے کیونکہ عورت طبیب مشفق بھی ہے اور معمار قوم بھی۔

بیگم سکندرہ ریاض کے خطاب کے بعد یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ اس بار طاہرہ بہنیں پچھلے سال کے مقابلہ میں بہت آگے بڑھ چکی تھیں۔ ان کے خطابات و مقالات میں پہلے سے زیادہ روانی اور فکری پختگی تھی۔ مافی الضمیر کے اظہار و تبیین میں پیش از بیش خود اعتمادی جھلک رہی تھی اور یہ حقیقت ثابتہ اُبھر کر سامنے آ رہی تھی کہ اسلامی گھرانوں کی

چار دیواری میں قرآنی فکر کے چراغ روشن کرنے کا امکان اب روشن سے روشن تر ہو رہا ہے فالحمد للہ علیٰ ذالک

چھٹا اجلاس

★ (مجلس استفسارات) ★

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

چودہ اپریل کی شب کو اس یادگار مجلس کا انعقاد ہوا جو ہر سال ضابطہ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ایوان میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ کنونشن کا ایوان، خمستانِ حجاز کا عکس جمیل قرار پا جاتا ہے۔ اور بادہ نوشانِ حرم کی قطاریں ذوقِ تمنا کی ہزاروں بے تابیاں لئے پیرِ مغاں کے گرد پھیل جاتی ہیں۔ اور جب گردشِ جام و سبو کا مرحلہ آتا ہے تو ایوان کی وسعتوں میں ایک کیف سا برسنے لگ جاتا ہے۔ شہری ہنگاموں سے دُور گلبرگ کے اس دور دراز ویرانے میں نور و نکہت کا ایک سماں طاری تھا۔ جب ستاروں کی قمقموں اور برقی قمقموں کی ضوفشانیوں میں پیرِ مغاں سوالات کا پلندہ ہاتھوں میں لئے اپنی مسند پر رونق افروز ہوئے اور بادہ مستوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

> سوال و جواب کی یہ نشست ہمارا ایک منفرد سا اجلاس ہے۔ میں ایک مدت سے قرآن کا طالبِ علم چلا آ رہا ہوں۔ اور کبھی اپنی کسی بات کو حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ اب بھی میں اپنی علمی بصیرت کے مطابق آپ کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس سے آپ کا اطمینان ہو گیا تو مجھے خوشی ہوگی۔ اور اگر اطمینان نہ ہوا اور کوئی خلش باقی رہے تو اسے بعد ازاں باہمی گفتگو سے سمجھا جا سکتا ہے اور خط و کتابت سے بھی۔

اس کے بعد مفکرِ قرآن نے ایک ایک سوال کو لیا اور باری باری پوری وضاحت سے اس کا جواب پیش کرنا شروع کر دیا۔ بڑے اہم سوالات سامنے آنے لگے اور پھر ان کے نکھرے نکھرے جوابات: قرآن کے عظیم طالبِ علم کے علم و بصیرت کی رفعتوں کو جانچنے کا اس سے بہتر شاید کوئی دوسرا مرحلہ نہ ہو۔

کیا قرآنی آیات جنتر منتر کا کام دے سکتی ہیں؟ جنت اور جہنم کی حقیقت کیا ہے؟ حیات بعد الممات کا قرآنی تصور کیا ہے؟ اپنی ارتقائی صفات کی بنا پر کیا انسانی غیر محدود شے ہے یا محدود؟ انسانی ذات کی نشو و نما کا

اصولی طریق، بروئے قرآن کیا ہے؟ نشو و نمایافتہ ذات کی پہچان کیا ہے اور اس کے مدارج کیا ہیں؟ دین خداوندی کے معاملہ میں امت کا فریضہ کیا ہے؟ قطبین سے قریبی ممالک میں ماہ رمضان کی سحری و افطاری اور پنج وقتہ نماز کے اوقات کا تعین کیسے ہوگا؟ ارکانِ اسلام کے بارے میں آپ کے عقائد کیا ہیں؟ قُلِ الْعَفْوَ کے قرآنی حکم میں انفرادی ضرورت کی حد کیا ہے؟ انسانی اختیار و ارادہ کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کی رُو سے تاریخ کی حیثیت کیا ہے اور اس کے واقعات کے صحیح یا غلط قرار پانے کی سند اور معیار کیا؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات سامنے آئے اور مفکر قرآن نے ان سب کے اس قدر واضح، متعین اور دو ٹوک جواب دیئے کہ ہر سائل عش عش کر اٹھا اور گیارہ بجے شب کے قریب جب یہ مجلس ختم ہوئی تو ہر شخص مفکر قرآن کی بصیرت قرآنی کا درخشندہ نقش دل میں لئے رخصت ہو رہا تھا۔ اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے ایک دیوانہ وفور شوق سے برملا کہہ رہا تھا

نگہ بلند، سخن دل نواز، روح پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ساتواں (اور آخری) اجلاس

۱۵ر اپریل (اتوار) کی صبح کو کنونشن کا آخری اجلاس تھا۔ پرویز صاحب اس اجلاس میں

اسلام کیا ہے؟

کے اہم موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔ یہ اجلاس ایک کھلا اجلاس تھا۔ اور اس میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹہ قبل ہی حاضرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ متوقع حاضری کے پیش نظر اس اجلاس میں نشستوں کے وسیع تر انتظامات کئے گئے تھے لیکن جلد ہی اراکین استقبالیہ کے چہرے بتا رہے تھے کہ اہل شوق کی اس طوفانی آمد سے عہدہ برا ہونا شاید ان کے بس کی بات نہ رہے۔ چنانچہ ایک مرحلہ پر نمایندگان کنونشن کو اپنی نشستیں خالی کرنی پڑیں اور ایوان کو اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ طلوع اسلام کی تمام کنونشنز میں اس قدر حاضری کی مثال موجود نہیں۔

ٹھیک نو بجے بزم کراچی کے ممتاز نمایندہ شیخ محمد شفیع صاحب نے کرسیٔ صدارت سنبھالی حافظ عبدالمجید صاحب نے تلاوت کلام پاک سے کارروائی کا افتتاح کیا اور اس کے بعد پنڈال میں یہ نغمہ گونجنے لگا ــــ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

خلیل مرزا صاحب کی سوز وساز میں ڈوبی ہوئی لے نئی منزلوں کا پیام دے رہی تھی اور جب انہوں نے کہا کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

تو پُرشوق نگاہیں بے تابانہ مفکرِ قرآن کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ زندگی جو سالہا سال تک تنہائیوں کی رفیق رہی اب سینکڑوں نہیں ہزاروں ہم نوا و ہم آہنگ یارانِ سفر کی رفاقت سے مالا مال تھی۔

خلیل مرزا کے بعد صدر اجلاس مائیک پر آئے اور طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کے تعارف کا فریضہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ جس طرح آنکھ کو دیکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح قرآن بھی نوعِ انسانی کے لئے زندگی کا نور بن کر آیا تھا۔ لیکن جلد ہی اسے مفاد پرستیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا۔ طلوعِ اسلام کی تحریک اسی نورِ مبین کو پردوں سے نکال کر منظرِ عام پر لانے کی تحریک ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں، طلوعِ اسلام کے اجراء سے پرویز صاحب نے اس مقصدِ عظیم کا آغاز فرمایا اور اب یہ تحریک برابر اس روشنی کو چار دانگ عالم میں پھیلاتی چلی جا رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ طلوعِ اسلام کے داعی میدانِ عمل سے دور ہیں۔ لیکن آپ قرآنی فکر کی اس روشنی کا جائزہ لیں جو گلی کوچوں سے آگے بڑھ کر حکومت کے ایوانوں اور عدالت کے کاشانوں تک پھیل رہی ہے اور خو عائلی قوانین کے نفاذ پر غور کریں تو ہمارے عمل کی زندہ شہادتیں آپ کے سامنے آجائیں گی۔ ہمارے لٹریچر اور نشر و اشاعت کے سلسلے کو دیکھئے۔ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ تحریک نے کس قدر قوتِ عمل کا ثبوت دیا ہے۔

پرویز صاحب کا خطاب

صدارتی تقریر کے بعد پرویز صاحب مسندِ خطاب پر رونق افروز ہوئے اور "اسلام کیا ہے؟" کے موضوع پر ان کا تاریخی خطاب شروع ہوا۔ مفکرِ قرآن نے سب سے پہلے اس جہانگیر نظام کی چند جھلکیاں پیش کیں جو کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں کارفرما ہے اور پھر بتایا کہ کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی اور نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے اس عالمگیر آئین سے مستثنیٰ قرار پا سکتا ہے؟ یہی اسلام اور دین اللہ ہے جو کائنات میں از خود کار فرما ہے لیکن انسان، صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کے باعث اس کی اطاعت پر مجبور نہیں بلکہ دل کی رضامندی سے بطیبِ خاطر اسے اختیار کرتا ہے۔ پھر انہوں نے سلسلۂ نبوت کی وضاحت کی اور بتایا یہ قوانین کس طرح منتخب ہستیوں کی وساطت سے، جنہیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے انسانوں تک پہنچائے گئے اور واضح کر دیا گیا کہ ان کا اتباع تربیتِ ذات اور زندگی کی خوشگواریوں کا باعث ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی تباہی و بربادی کا سامان ثابت ہوگی۔

اپنے خطاب میں پرویز صاحب نے مومن اور کافر کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ مومن کی یہ زندگی بھی خوشگوار اور شاداب کی جنت ہوگی اور مستقبل بھی ہر قسم کی شادابیوں سے مالا مال۔ انہوں نے دنیا و آخرت کا مفہوم بھی قرآن کی روشنی میں واضح فرمایا اور بتایا کہ نبی اکرمؐ نے کس طرح اپنے بے مثال عمل سے اسلام کو ایک نظامِ معاشرہ کی صورت میں متشکل فرمایا اور اس کے درخشندہ نتائج اس کی صداقت کا زندہ جاوید ثبوت بنتے چلے گئے۔ یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب نے انسانوں کے اس خود ساختہ مذہب کا ذکر کیا جو ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت اور پیشوائیت کا مرکب اور آج مسلمانوں کے ہاں رائج ہے۔

اپنا اہم خطاب ختم کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے فرمایا۔

> ایک وہ اسلام تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی۔ اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جس سے ہمارا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے لیکن وہ اسلام جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، آج بھی ہمارے پاس خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟

ان الفاظ کے ساتھ پرویز صاحب کا اہم خطاب ختم ہوگیا۔ پورا ایوان کیف و مستی کی بیخودی میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ اسلام کی حقیقت اور عالم آرائی کے گہرے نقوش دل کی گہرائیوں میں مرتسم تھے اور زبانِ حال بے ساختہ پکار رہی تھی کہ اسلام کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ پاکستان کی ایک ممتاز شخصیت، جسے تحریکِ پاکستان میں نمایاں مقام حاصل رہا، وجد و مسرت سے جھومتی ہوئی آگے بڑھی اور وفورِ کیفیت میں یہ کہتے ہوئے مفکرِ قرآن سے بغلگیر ہوگئی۔

زندہ باد! زندہ باد!! آپ نے دلوں کو نئی روشنی عطا کردی۔

ہم بھٹکتے رہے اک عرصہ بیابانوں میں
بلّٰہ الحمد کہ پہنچے ہیں گلستانوں میں

الوداعی خطاب

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں میں

کھلا اجلاس ختم ہوگیا لیکن ہمصفیرانِ چمن کی الوداعی رسم کی ادائیگی ابھی باقی تھی۔ ٹھیک بارہ بجے اس تقریب کا

آغاز ہوا جو یاران ہم سفر کی دلی حسرتوں کی آئینہ دار تھی۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے اور پُر ملال نگاہیں سٹیج پر بچھی ہوئی تھیں۔ اسی سٹیج سے گذشتہ تین دنوں میں بار بار میر کارواں کی زندگی بخش آواز گونجتی اور نئی منزل کا سُراغ دیتی رہی۔ لیکن اب کے باوجود مائیک کے سامنے نمودار ہوئے تو ان کی افسردہ نگاہوں میں ایک افسانۂ غم جھلک رہا تھا۔ ضبط کے بند ٹوٹتے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک آہ بھری اور بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے ایک نازک فریضہ کی ادائیگی کے لئے لبوں کو جنبش دی۔ اُن کی آواز میں لرزشیں اُبھر رہی تھیں اور فضا تھرتھرا رہی تھی جب انہوں نے آہستہ آہستہ یہ کہنا شروع کیا۔۔۔

عزیزانِ من! جمعرات کی شام کو جب میں یہاں آیا تو حسین تمناؤں کی ایک بساط سی بچھی جا رہی تھی۔ ایک سال بعد دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں کھلکھلا اٹھیں اور نگاہوں میں سرور آ گیا لیکن آج جب پہلے ہی کمرے میں قدم رکھا تو یہ بساط اٹھائی جا رہی تھی۔۔۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

"سوچتا ہوں کہ سال بھر کے طویل لمحے آپ کے انتظار میں کیونکر بسر ہوں گے۔

کسے خبر کہ نگارِ سحر کی حسرت میں
تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری

"ہر سال یہ ہوتا چلا آ رہا ہے اور سال بسال یہ منظر کس قدر ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے اس کی ترجمانی ممکن نہیں۔ آپ آ گئے تو کاشانۂ ہستی میں رونق آ گئی۔ اب آپ جا رہے ہیں تو جو کچھ یہاں طے کیا ہے اُسے یارانِ ہم سفر تک پہنچا دیجئے یہی تحفہ ہے جو آپ ان کے لئے کنونشن سے لیجا سکیں گے۔

"میں اس مٹھی بھر جماعت کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی بے سروسامانی میرے سامنے ہے۔ ایسے احباب بھی ہیں جو سال بھر اس سالانہ تقریب کا انتظار کرتے رہے لیکن پھر بھی نہ آ سکے کیونکہ ان کے پاس آنے کے لئے کرایہ نہیں تھا۔ ایسی بے سروسامان جماعت! اور عزم یہ لے کر اٹھی ہے کہ خدا کی کتاب اقوامِ عالم کا ضابطۂ حیات قرار پا جائے ع

ذرّہ تا چیز و تعمیرِ بیابانے نگر

" ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے اور بھولئے نہیں کہ اگر مخالفتوں کے اس ہجوم میں جو آپ کے گرد چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، آپ کی کوششوں میں کمی واقع ہو گئی تو یہ کرنیں جو فضا میں پھیل رہی ہیں ان پر جہالت اور توہم پرستیوں کے

پر صدمے پڑ جائیں گے۔ سوچئے کہ کتنی اہم ذمہ داری آپ کے سروں پر آپڑی ہے۔

ہم اگر ہوش میں عدم آئیں
چشم ساقی کی بات جاتی ہے

"چشم ساقی کی بات" رکھنے کے لئے جو کچھ لٹتا ہے لٹ جانے دیجئے۔ قرآن نے آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں اس کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ سازو یراق کی کمی پر پریشان نہ ہوجئے۔ آگے بڑھتے جائیے اور یقین رکھئے کہ خدا کی امداد اس کی کائناتی قوتوں کے دوش پر سوار ہو کر آئے گی۔ میں آپ سے اور کیا کہوں!

ایک آنسو میں کہہ دیا غم دل
کس قدر میں نے اختصار کیا

آپ کی یاد آئندہ کنونشن تک میرے لئے سرمایۂ حیات رہے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اب تنہا نہیں۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
چمن میں مرے رازداں اور بھی ہیں

خدا آپ کے عزائم کو وسعتیں عطا کرے اور بازوؤں کو قوت عمل سے بہرہ اندوز فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

قراردادیں

(جو کنونشن میں متفقہ طور پر منظور ہوئیں)

قرارداد تعزیت (۱) ____________ محرک۔ عزیز احمد قریشی (نمائندہ بزم طلوع اسلام راولپنڈی)

طلوع اسلام کنونشن کا یہ سالانہ اجلاس بزم راولپنڈی کے سرگرم اور صاحب ایثار نمائندہ چوہدری فیروز علی بھٹی مرحوم کی وفات حسرت آیات پر دلی اندوہ و ملال کا مخلصانہ اظہار کرتے ہوئے مرحوم کی ان گرانقدر خدمات کو خراج تحسین پیش کرتا ہے جو مرحوم نے نمائندہ بزم کی حیثیت سے قرآنی تحریک کے لئے مسلسل سرانجام دیں۔

یہ اجلاس اس سانحہ غم کو قرآنی تحریک کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیتا ہے اور بدرگاہ رب العزت دعا کرتا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

قرارداد تعزیت (۲) ——— محرک۔ شیخ محمد اقبال (نمائندہ بزم طلوع اسلام گوجرانوالہ)

کنونشن کا یہ اجلاس بزم رسول نگر کے ممتاز سرپرست خان بہادر قاضی حفیظ الدین مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر رنج و غم کے انتہائی احساس سے اظہار تعزیت اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہے۔ یہ اجلاس مرحوم کے اس والہانہ ذوق و شوق کو قدر و احترام سے یاد کرتا ہے جسے وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بروئے کار لاتے رہے۔

قرارداد تعزیت (۳) ——— محرک ڈاکٹر رضا محمد خاں (مردان)

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس قرآنی انقلاب کے شیدائی اور ضلع مردان کے نامور خادم خلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم کی رحلت پر بصمیم قلب غم گسار ہے اور مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہے۔ اس اجلاس کی رائے میں مرحوم ڈاکٹر صاحب شب و روز جس خدمت خلق میں سرگرم کار رہے اور اس طرح قرآنی اخلاق کا جو گہرا نقش دلوں میں قائم کیا اسے ہمیشہ امتنان و تشکر کے مخلصانہ احساس سے یاد کیا جائے گا۔

قرارداد تعزیت (۴) ——— محرک۔ مرزا علی احمد خاں (نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ پشاور)

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس بزم پشاور کے سرگرم قرآنی رفیق ڈاکٹر یوسف علی مرحوم کی وفات پر دلی ملال کا اظہار کرتے ہوئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم پشاور میں قرآنی فکر کے اولیں داعی تھے اور وہ زندگی بھر جس والہانہ جذبہ سے اس فکر کی اشاعت اور عوام کی خدمت میں سرگرم کار رہے یہ اجلاس اس پر ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہے۔

قرارداد (۵) ——— محرک۔ صدر اجلاس مولانا عبدالرب صاحب (کراچی)

طلوع اسلام کنونشن کو نمائندگان سے، حالیہ فتویٰ کفر کے مضر اثرات کی تفصیلات دلی افسوس کے ساتھ معلوم ہوئی ہیں۔ جن میں میتوں کی نماز جنازہ کے مقاطعہ، سوشل بائیکاٹ اور مختلف قسم کی معاشرتی دھمکیاں شامل تھیں اور طے کیا گیا کہ

۱۔ حکومت کو اس خطرہ سے آگاہ کیا جائے جو مارشل لاء کے انعقام پر فتویٰ کے زیر اثر امن عامہ میں شدید خلل پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

۲۔ حکومت سے پرزور درخواست کی جائے کہ حامیان فتویٰ کے خلاف مارشل لاء ریگولیشن (۵۹) کے تحت فوری کارروائی کی جائے اور اس قسم کے فتنہ و فساد کے سدباب کے لئے قانونی اور دیگر ضروری اقدامات کئے جائیں۔ نیز فتویٰ گروں کو متنبہ کیا جائے کہ مروجہ قانون کے تحت کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی اور شخص کے کفر و ایمان پر محاکمہ کرے۔ یہ انتباہ اس لئے بھی ضروری

ہے کہ چونکہ نئے آئین کے تحت صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے، یہ امکان ہر وقت موجود رہے گا کہ مسلمان صدر کو بھی فتویٰ کے ذریعہ کافر قرار دیدیا جائے جس سے ملک میں نہایت مضحکہ انگیز صورت پیدا ہو جائے گی۔

کنونشن نے اس امر پر بھی اظہار اطمینان کیا ہے کہ شدید اشتعال کے باوجود اراکین بزم ہائے طلوع اسلام نے ہمیشہ انتہائی صبر و سکون سے کام لیا ہے اور متوقع ہے کہ آئندہ بھی وہ مشتعل ہونے کی بجائے امن عامہ میں خلل پیدا کرنے والوں کو ناکام بنانے کی کوششیں جاری رکھیں گے

قرارداد (۶) ——— محرک۔ صدر اجلاس مولانا عبدالرب صاحب (کراچی)

طلوع اسلام کنونشن نئے آئین کی اس شق کا خیر مقدم کرتا ہے کہ قرآن کریم اور اسلامیات کی تعلیم مسلمانان پاکستان کے لئے لازمی ہوگی اور توقع رکھتا ہے کہ ادارۂ طلوع اسلام جلد از جلد ایسی کتابیں تیار کرنے کا انتظام کریگا جو چھوٹے بچوں سے لے کر بڑے طالب علموں تک کو قرآنی تعلیمات سے حسب استعداد فائدہ اٹھانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

قرارداد (۷) ——— محرک۔ صدر اجلاس مولانا عبدالرب صاحب (کراچی)

طلوع اسلام کنونشن اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کو ہدایت کرتا ہے کہ قرآنی تعلیم کی راہ میں اس جامد ذہنیت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، جو ہر اصلاح کی کوشش کو الحاد وغیرہ سے تعبیر کرتی ہے، حاملین ذہنیت سے علیحدگی کی بجائے ان کے ساتھ ہمدردی اور موعظۃ الحسنۃ کا رویہ اختیار کریں۔

قرارداد (۸) ——— محرک۔ شیخ محمد شفیع صاحب نمایندہ بزم طلوع اسلام کراچی

گذشتہ کنونشن میں بزم ہائے طلوع اسلام کے نظم و ضبط اور دیگر امور کی نگرانی کے لئے مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آئی تھی لیکن تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ بزموں کا کام ادارۂ طلوع اسلام کے ذریعہ زیادہ تسلی بخش طور پر عمل میں آتا ہے۔ لہٰذا مجلس عاملہ کی تشکیل کی قرارداد کو منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ فیصلہ بھی منسوخ سمجھا جائے جس کے باعث بزموں میں آمدنی کا نصف حصہ مجلس عاملہ کو بھیجتی تھیں۔

قرارداد (۹) ——— محرک۔ محمد اسلام صاحب (کراچی)

کنونشن طے کرتا ہے کہ آئندہ سالانہ کنونشن کا ایجنڈہ بزموں کو قبل از وقت بھیجا جائے تاکہ شرکت کرنے والے نمایندے تجاویز پر اپنی اپنی بزموں کا نقطۂ نظر کماحقہٗ پیش کر سکیں۔

(ب) ـــــــــــــــــــ (محرک۔ حافظ برکت اللہ صاحب)

قرار پایا کہ سب کنونشن میں سالانہ کنونشن کی منظور شدہ تجاویز پر کارروائی کا جائزہ لینے کے بعد اگر کوئی نئی تجاویز زیر غور آئیں تو وہ فیصلہ کے لئے آئندہ سالانہ کنونشن میں پیش کی جائیں۔

قرارداد (۱۰) ـــــــــــــــــــ محرک۔ میاں عبدالخالق صاحب صدر کنونشن کمیٹی و صدر اجلاس

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس بخلوص قلب شیخ اخلاص احمد صاحب کا سپاس گزار ہے کہ انہوں نے کنونشن کے انعقاد کے لئے اپنا وسیع و عریض بنگلہ مرحمت فرما کر کنونشن کمیٹی کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔

قرارداد (۱۱) ـــــــــــــــــــ محرک۔ صدر اجلاس میاں عبدالخالق صاحب (صدر کنونشن کمیٹی)

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس کراچی کے ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے لاہور میں کئی روز قبل از وقت پہنچ کر کنونشن کے انتظامات کی تکمیل میں انتہائی محنت اور سرگرمی سے ہاتھ بٹایا اور بعد ازاں کنونشن کے اہم معاملات کی بجا آوری اپنے ذمے لیکر انہیں حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔

قرارداد (۱۲) ـــــــــــــــــــ محرک۔ صدر اجلاس میاں عبدالخالق صاحب (صدر کنونشن کمیٹی)

کنونشن کا یہ اجلاس بزم طلوع اسلام لاہور کا سپاس گزار ہے کہ اس نے کنونشن کے انعقاد کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اس کے انتظامات کی شایان شان تکمیل کے لئے شب و روز جانفشانی سے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔

قرارداد (۱۳) ـــــــــــــــــــ محرک۔ مولانا عبدالرب صاحب (کراچی)

کنونشن کا یہ اجلاس صدر کنونشن کمیٹی میاں عبدالخالق صاحب اور ان کے جملہ رفقاء کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے کنونشن کے سلسلے میں ذمہ داریوں کا بار گراں اپنے سر لیا۔ اور انتہائی سرگرمی اور حسن انداز سے ان کی تکمیل کی۔

قرارداد (۱۴) ـــــــــــــــــــ

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس جملہ بزمہائے طلوع اسلام کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اس کنونشن کو کامیاب بنانے میں دلی تعاون کا ثبوت دیا۔ اور ان سے توقع کرتا ہے کہ وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں پہلے سے بھی زیادہ جدوجہد کریں گے۔ (کرسی صدارت)

قرارداد (۱۵) کنونشن کا یہ اجلاس بزمہائے طلوع اسلام کی طرف سے آمدہ رضاکاران کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اپنی شب و روز بے لوث اور مخلصانہ خدمات سے کنونشن کو نوازا۔ (کرسی صدارت)

قرارداد (۱۶) طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس میاں عبدالخالق صاحب اعزازی مینیجنگ ڈائرکٹر کو میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کی مدت میں انکی بے لوث خدمات کے اعتراف میں جو انہوں نے قرآن حکیم کے پیغام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں سرانجام دی ہیں، ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے اور بارگاہ رب العزت دست بدعا ہے کہ وہ انہیں اپنی مساعی جمیلہ کو تیز تر کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

نمائندہ
شرکائے کنونشن

لاہور

۱- محترم پرویز صاحب
۲- محترم عبدالعلی صاحب
۳- محترم قمر بٹ صاحب
۴- محترم خلیل مرزا صاحب
۵- محترم محمد رشید صاحب
۶- محترم خواجہ محمد حسین صاحب
۷- محترم فتح محمد چوہدری صاحب
۸- محترم امیر الدین صاحب
۹- محترم محمد یونس صاحب
۱۰- محترم محمد یامین صاحب
۱۱- محترم میاں عبدالخالق صاحب
۱۲- محترم عبداللطیف نظامی صاحب
۱۳- محترم راجہ محمد اکرم صاحب ایڈووکیٹ
۱۴- محترم محمد شفیع صاحب
۱۵- محترم محمد احمد خاں صاحب
۱۶- محترم محمد اسحاق صاحب
۱۷- محترم محمد جمیل مرزا صاحب
۱۸- محترم عبدالقیوم صاحب
۱۹- محترم محمد اشرف صاحب
۲۰- محترم محمد الدین شیخ صاحب
۲۱- محترم شیخ سراج الحق صاحب
۲۲- محترم محمد خالد قریشی صاحب
۲۳- محترم مشتاق احمد صاحب
۲۴- محترم سرور خاں صاحب
۲۵- محترم ایم-ایف- بٹ صاحب
۲۶- محترم محمد حسین تارڑ صاحب
۲۷- محترم ظفر عباس قریشی صاحب
۲۸- محترم صفدر سلیمی صاحب
۲۹- محترم چوہدری حبیب اللہ خاں صاحب
۳۰- محترم خورشید عالم صاحب
۳۱- محترم عارف بٹالوی صاحب

کراچی

۱۔ محترم مولانا عبد الرب صاحب
۲۔ محترم حافظ برکت اللہ صاحب
۳۔ محترم حاجی عبد الحنیف صاحب
۴۔ محترم ملک عبد الوحید صاحب
۵۔ محترم لطیف الرحمٰن صدیقی صاحب
۶۔ محترم محمد اسلام صاحب
۷۔ محترم شیخ رحمت اللہ صاحب
۸۔ محترم سید محمد سلطان ترمذی صاحب
۹۔ محترم شہاب الدین احمد صاحب
۱۰۔ محترم شمس الدین پراچہ صاحب
۱۱۔ محترم محمد اسمٰعیل صاحب
۱۲۔ محترم علاؤ الدین صاحب
۱۳۔ محترم ڈاکٹر شمس الدین صاحب
۱۴۔ محترم شیخ محمد شفیع صاحب
۱۵۔ محترم خورشید علی خاں صاحب

راولپنڈی

۱۔ محترم عزیز احمد قریشی صاحب
۲۔ محترم مرزا ظہور الحق صاحب
۳۔ محترم محمد اقبال صاحب
۴۔ محترم رضوان الحسن صاحب
۵۔ محترم فقیر محمد صاحب مخمور
۶۔ محترم محمد یوسف شاہ صاحب بخاری
۷۔ محترم محمد آصف حسین صاحب
۸۔ محترم محمد یوسف صاحب سرحدی
۹۔ محترم عبد الحئی مشتاق صاحب
۱۰۔ محترم محمد صادق صاحب
۱۱۔ محترم سعد اللہ خاں صاحب
۱۲۔ محترم محمد الدین صاحب
۱۳۔ محترم رحمت اللہ صاحب
۱۴۔ محترم غلام حسین صاحب شاد

مری

۱۔ محترم حنیف وجدانی صاحب
۲۔ محترم مظفر عباسی صاحب

واہ کینٹ

۱۔ محترم چوہدری عنایت خاں صاحب

پشاور

۱۔ محترم علی احمد خاں مرزا صاحب
۲۔ محترم حاجی خیر محمد پراچہ صاحب
۳۔ محترم یوسف ضیا صاحب
۴۔ محترم محمد رفیق سیٹھ صاحب
۵۔ محترم ظہور الدین میر صاحب
۶۔ محترم مراد علی شاہ صاحب
۷۔ محترم محمد حسین صاحب
۸۔ محترم اطہر بھٹی صاحب
۹۔ محترم محمد حسین آزاد صاحب

مردان

۱۔ محترم محمد فضل خالق خاں صاحب (چارسدہ)

۲۔ محترم ڈاکٹر رضا محمد خاں صاحب
۳۔ محترم سید علی گوہر صاحب
۴۔ محترم شیخ محمد رفیق صاحب
۵۔ محترم عبداللطیف صاحب
۶۔ محترم نیاز احمد صاحب
۷۔ محترم فضل کریم صاحب
۸۔ محترم محمود علی صاحب
۹۔ محترم عبدالمتین صاحب

ضلع جھنگ

۱۔ محترم محمد خاں خالد صاحب (کلری)
۲۔ محترم مستری غلام محمد صاحب (چک ۲۲۵)
۳۔ محترم نور محمد صاحب (چنیوٹ)
۴۔ محترم محمد اسلم بیر صاحب
۵۔ محترم محمد منیر صاحب
۶۔ محترم شوکت صاحب
۷۔ محترم مستری کریم بخش صاحب

گوجرانوالہ

۱۔ محترم شیخ محمد اقبال صاحب
۲۔ محترم اکبر علی شاہ صاحب
۳۔ محترم محمد صادق صاحب
۴۔ محترم چوہدری سردار خان صاحب (رسول نگر)

ضلع جہلم

۱۔ محترم خواجہ خدا بخش صاحب (پنڈ دادن خاں)
۲۔ محترم خان عبدالرحیم خاں صاحب (〃)
۳۔ محترم حافظ عبدالمجید صاحب (پنڈ دادنخاں)
۴۔ محترم بابو گل محمد صاحب (〃)
۵۔ محترم سید محمد حسین شاہ صاحب (سید حسین)
۶۔ محترم سید امیر حسین شاہ صاحب (〃)
۷۔ محترم ڈاکٹر اعظم صاحب (〃)
۸۔ محترم ڈاکٹر محمد اکرم صاحب (〃)

ضلع شیخوپورہ

۱۔ محترم عبدالکریم نظامی صاحب (ننکانہ)

ضلع ملتان

۱۔ محترم شیخ عبدالحی صاحب (بوریوالہ)
۲۔ محترم انوارالحق صاحب (〃)
۳۔ محترم سراج منیر صاحب (〃)
۴۔ محترم چوہدری عطا محمد صاحب علوی (بیچ کسی)
۵۔ محترم حکیم احمد دین صاحب (〃)
۶۔ محترم محمد علی صاحب (〃)
۷۔ محترم حشمت شاہ صاحب (〃)
۸۔ محترم محمد شفیع صاحب (〃)
۹۔ محترم اختر علی صاحب (ملتان)
۱۰۔ محترم محمد یاسین صاحب (〃)

لائل پور

۱۔ محترم افتخار عالم صاحب
۲۔ محترم شیخ عنایت اللہ صاحب
۳۔ محترم خاں عبدالحمید خاں صاحب
۴۔ محترم چوہدری یوسف علی صاحب صوبیدار

۵۔ ماسٹر عبدالعزیز صاحب
۶۔ محترم سید دانش صاحب
۷۔ محترم چوہدری حبیب صاحب
۸۔ محترم چوہدری نذیر احمد صاحب (سمندری)

سرگودھا

۱۔ محترم حکیم حسن محمد نظامی صاحب
۲۔ محترم فیاض علی خاں صاحب
۳۔ محترم سیٹھ محمد عثمان صاحب
۴۔ محترم محمد حسین صوفی صاحب
۵۔ محترم محمد سرور صاحب
۶۔ محترم چوہدری غلام نبی صاحب ٹھیکیدار
۷۔ محترم اشتیاق علی صاحب (شاہ پور صدر)
۸۔ محترم مولانا مولا بخش صاحب
۹۔ محترم محمد سعید صاحب
۱۰۔ محترم ملک غلام جیلانی صاحب
۱۱۔ محترم محمد طفیل صاحب
۱۲۔ محترم ملک اللہ داد خاں صاحب (فوان لوک)
۱۳۔ محترم چوہدری نصر اللہ خاں صاحب (چک شمالی)
۱۴۔ محترم چوہدری امان اللہ خاں صاحب (")
۱۵۔ محترم چوہدری الطاف حسین صاحب (")
۱۶۔ محترم ملک احمد دین صاحب (")

کوئٹہ

۱۔ محترم ملک غلام کبریا صاحب

گجرات

۱۔ محترم اللہ دتا صاحب (یونہ منڈی)
۲۔ محترم محمد اشرف صاحب (")
۳۔ محترم اصغر علی صاحب (")
۴۔ محترم خدا بخش صاحب (")
۵۔ محترم چوہدری محمد اکبر صاحب (")
۶۔ محترم شیخ عبدالرؤف صاحب (جلالپور جٹاں)

ضلع سیالکوٹ

۱۔ محترم خواجہ محمد انور صاحب
۲۔ محترم چوہدری محمد اشرف صاحب
۳۔ محترم چوہدری فیروز الدین صاحب (شکر گڑھ)

ڈیرہ اسمٰعیل خاں

۱۔ محترم حاجی نظام بخش خاں صاحب
۲۔ محترم یار محمد خاں صاحب

مظفر گڑھ

۱۔ محترم شیخ غلام نبی صاحب (لیہ)
۲۔ محترم غلام نبی گھمن صاحب (")

کوہاٹ

۱۔ محترم قاضی سلیم اللہ صاحب

ڈیرہ غازی خان

۱۔ محترم میاں عطاء اللہ صاحب

ساقیا! بر جگرم شعلۂ نمناک انداز

دگر آشوبِ قیامت بہ کفِ خاک انداز

پرویز صاحب کا استقبالیہ

جس سے انھوں نے طلوعِ اسلام کنونشن (۱۹۶۳ء) کے مندوبین کو

خوش آمدید کہا

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) گلبرگ لاہور

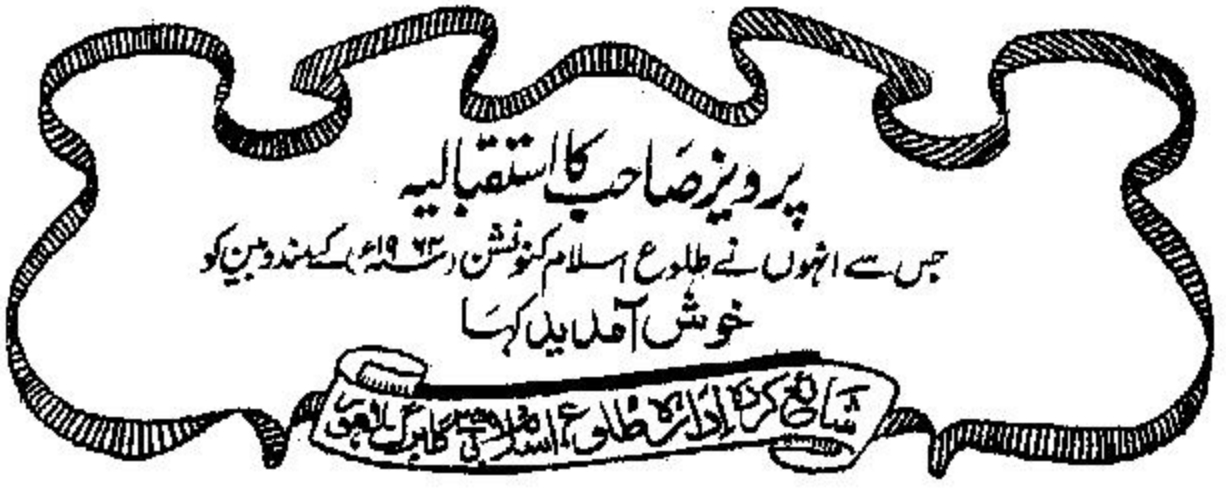

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ
سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ
شاہینِ من بہ صیدِ پلنگاں گذاشتی!
ہمّت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار
تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یارانِ ہم سفر کے نام

دریں صحرا گذر افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نغمہ ہائے ساربانے را

عزیزانِ ہم عناں۔ سلام و رحمت۔

ایک سال کی مدتِ فراق، بڑی طویل و صبر آزما ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کی زہرہ گدازی و جگر خراشی کو کم کرنے کے لئے کرتا یہ ہوں کہ جب کبھی کچھ لکھتا ہوں تو آپ احباب کو تصور میں سامنے رکھ لیتا ہوں۔ اور چونکہ لکھتا رہتا ہوں سال بھر برابر، اس لئے آپ مجھ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس طرح میں فراق کی گھڑیوں کو، وصال کے لمحات میں بدل لیتا ہوں، اور ہر پوچھنے والے سے ایک تبسم زیر لب سے کہہ دیتا ہوں کہ

بیاد گیسوئے رخسارِ یار گذری ہے
بڑے مزے میں شبِ انتظار گذری ہے

لیکن یہ تسکین، بہرحال ایک خوشگوار فریب سا ہوتا ہے۔ اس جدائی کی کوفت، فی الواقعہ اس وقت دور ہوتی ہے جب آپ احباب اپنی محبت و خلوص کے خرمن گل لئے، وجہِ شادابیٔ قلب و نظر ہو جاتے ہیں، اور یوں، سال بھر کے انتظار کے بعد، پھر ساری فضا پر بہار چھا جاتی ہے۔ اور میری تیرہ سامانی بے تابانہ پکار اٹھتی ہے کہ

حیرت کے غم کدہ میں خوشی کا گذر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

خدا آپ کے جذبۂ رہ نوردی کو تیز سے تیز تر کر دے، کہ اسی سے آپ کا یہ کاروانِ شوق، بایں ہمہ جذب و کیف قرآنی منزل کی طرف جادہ پیما ہے۔

مپرس از کاروانِ جلوہ مستاں — ز اسبابِ جہاں برکندہ دستاں
بجانِ شاں، ز آوازِ جرس شور — چو از موجِ نسیمے در نیستاں

برادرانِ گرامی قدر!

مبدءِ فیض کی گرم گستری سے، قرآنی فکر کی اس حقیری کوشش کو جس قدر کامیابی ہو رہی ہے، میں جب اس پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میرا سر نیاز بدرگاہِ رب العزت، قدم قدم پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ تعداد کے اعتبار سے مٹھی بھر انسانوں کی یہ جماعت۔ ساز و سامان کے لحاظ سے بالکل بے بضاعت۔ نہ کسی دنیاوی سہارے کی کوئی تائید۔ نہ کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد۔ ایسے نامساعد حالات اور ان میں کامیابی کا یہ عالم کہ ملک کا کوئی بعید سے بعید تر گوشہ بھی ایسا نہ ہوگا جو اس آواز سے متعارف نہ ہو۔ قوم کے تعلیم یافتہ ہوشمند طبقہ (INTELLIGENTSIA) میں، کسی نہ کسی نوعیت سے،

تحریک کی مقبولیت

اب قرآن کا چرچا ہو رہا ہے۔ نوجوان طالب علموں کا حلقہ اس آواز سے متاثر ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ تک کے علمی گوشوں میں یہ آواز پہنچ چکی ہے اور وہاں کے ریسرچ اسکالرز، اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اکثر آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں، ایک جرمن مصنف نے، اپنی سیاحتِ ہند و پاکستان سے متعلق ایک دلچسپ کتاب شائع کی ہے جس کے ایک باب میں اس قرآنی تحریک کے متعلق اپنے انداز میں تفصیل سے لکھا ہے ـــــ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا ـــــ اس محیر العقول کامیابی کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ حق کی آواز میں خود اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساز و یراق کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیتا ہے۔ اور جو جماعت اس آواز کو لے کر آگے بڑھتی ہے، خدا کی کائناتی قوتیں آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور دنیا اس نظارہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی

ہے کہ

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

مجھے علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین ہو رہا ہے، اور اس سے یہ امید ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر میرے سامنے آ رہی ہے کہ

شبنم افشانی میری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

حق کی آواز کی تائید کے سلسلہ میں بعض اوقات فطرت کا پروگرام عجیب ہوتا ہے۔ وہ حق کے مؤیدین کے ذرائع کی کمی کو مخالفین کے زورِ مخالفت سے پورا کر دیتی ہے۔ ہماری قرآنی فکر کی نشر و اشاعت

مخالفت کا فائدہ کے سلسلہ میں بالکل یہی ہوا ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ ہم آنی قلیل سی مدت میں اسے اس قدر عام کر سکتے۔ مخالفین کے بے پناہ پراپیگنڈہ نے یہ مقصد جس تیزی سے پورا کر دیا وہ ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفاں
کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

سچ ہے۔ گرگٹ آتش نمرود کو بھڑکانے کے لئے پھونکیں مارتا ہے اور نتیجہ اس کا گلزارِ ابراہیمیؑ کی نزہت فشانیاں ہوتا ہے[1] خدا اس کے پھیپھڑوں کی قوت کو اور زیادہ کرے۔

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا۔ ساقی کا۔ مے کا۔ خم کا پیمانے کا نام

برادرانِ عزیز! کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ طلوعِ اسلام کی اس قدر مخالفت کیوں ہوتی ہے؟

مخالفت کی وجہ ہمارے ہاں کے مذہبی فرقے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں کیونکہ ہر فرقہ اپنا جتھہ قائم رکھنا اور اسے بڑھانا چاہتا ہے۔ طلوعِ اسلام کوئی مذہبی فرقہ نہیں۔ اس کی

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کے لئے آگ روشن کی گئی تو باقی جانور اسے بجھانے کی فکر کرتے تھے لیکن گرگٹ پھونکیں مار مار کر اسے بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ آگ ٹھنڈی ہو کر پھول بن گئی تھی۔ یہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔

ساری تعلیم (قرآن کریم کی روشنی میں) فرقہ بندی اور گروہ سازی کے خلاف ہے۔ وہ وحدتِ اُمت کا داعی اور اخوتِ اسلامی ـــ بلکہ نوعِ انسان کی عالمگیر برادری ـــ کا نقیب ہے۔ جو لوگ اس کی پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہیں وہ نہ کسی نئے فرقہ میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی نوعیت سے، باقی مسلمانوں سے الگ کوئی اپنا گروہ بناتے ہیں۔ وہ اسلامی ارکان (نماز۔ روزہ وغیرہ) اسی طریق سے ادا کرتے رہتے ہیں جس طریق سے وہ ادا کرتے چلے آتے تھے۔ (میں خود، حنفی گھرانے میں پیدا ہوا تھا، اس لئے حنفی طریقے کے مطابق نماز پڑھتا ہوں)۔ نہ ہی وہ، ختم نبوت ـــ کے بعد کسی نئے ظہور کے قائل ہیں ـــ خواہ وہ نبوت کے نام سے ہو یا مسیحیت اور مجددیت کے نام سے ـــ نبوت اور مجددیت تو ایک طرف، یہ تو اشخاص کی سیادت و امارت تک کا بھی قائل نہیں۔ اس کے نزدیک، ختم نبوت کے بعد، وابستگی صرف اسلامی نظام سے ہو سکتی ہے، افراد و اشخاص سے نہیں۔ افراد میں سے نہ کسی کا قول کسی کے لئے سند ہو سکتا ہے، نہ کسی کا عمل کسی کے لئے حجت۔ ظاہر ہے کہ جن کا عقیدہ اور مسلک یہ ہو، ان کے ہاں فرقہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، طلوع اسلام کی مخالفت، ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ہو ہی نہیں سکتی۔

مذہبی فرقوں سے آگے بڑھئے تو سیاسی پارٹیوں کی آپس میں کشمکش رہتی ہے۔ کیونکہ ہر پارٹی کے سامنے اپنے اپنے سیاسی مفاد ہوتے ہیں۔ طلوع اسلام کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے بھی نہیں۔ اس کے نزدیک مذہبی فرقوں کی طرح، سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی امت کی تخریب اور دین کی تباہی کا موجب ہے۔ ملت اسلامیہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر پارٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سیاسی رقابت کی بنا پر بھی طلوع اسلام کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

اس سے واضح ہے کہ طلوع اسلام کی مخالفت اس لئے نہیں ہوتی کہ ان حضرات کو ڈر ہے کہ یہ کسی دن ایک طاقتور فرقہ یا پارٹی بن جائے گا۔ اس کی مخالفت، درحقیقت اُس قرآنی آواز کی مخالفت ہے جسے یہ بلند کرتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں ـــــ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ (۶/۳۳)۔ یہ تیری مخالفت نہیں کرتے۔ یہ مخالفت کرتے ہیں قوانین خداوندی کی جن کا یہ انکار کرتے ہیں ـــ ذرا سوچئے کہ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسا لٹریچر شائع ہو رہا ہے جو نہ صرف دین کی اصل و بنیاد کے خلاف ہے بلکہ وہ قوم کے اخلاق تک کو تباہ کرتا ہے۔ ان حضرات نے کبھی متحدہ محاذ بنا کر یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس لٹریچر کو ضبط کر لیا جائے۔ قوم میں ہزارہا افراد ایسے ہیں جو خدا۔ رسول۔ وحی۔ آخرت کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے دہریہ (ATHEIST) ہونے پر فخر

کرتے ہیں۔ ان حضرات کی طرف سے نہ ان کے خلاف کبھی کفر کے فتوے شائع ہوتے ہیں۔ نہ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے نہ ان کے نماز جنازہ پڑھنے پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے، نہ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کئے جانے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن حامیانِ دینِ مبین کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے تو ان لوگوں کے خلاف جو خدا، رسول، کتاب، ملائکہ، آخرت پر خالصتہً اس طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح قرآن کا مطالبہ ہے۔ جو اس کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی کتاب کا نور اقصائے عالم میں پھیل جائے۔ جن کی سعی و کاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں میں پھر سے وہ صحیح اسلامی نظام قائم ہو جائے جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حجاز کی سرزمین میں محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا تھا اور جس کے قیام میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔ ان لوگوں کے خلاف، شرق سے غرب تک متحدہ محاذ قائم کیا جاتا ہے، اور مخالفت کا طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بارگاہِ تقدس مآب سے فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ

> یہ لوگ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے عقدِ نکاح میں کوئی مسلمان عورت نہیں رہ سکتی۔ اور نہ کسی مسلمان عورت کا ان سے نکاح ہو سکتا ہے۔ نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ نہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں ان کا دفن کیا جانا جائز ہے[1]۔

حتیٰ کہ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ واجب القتل ہیں ـــــ یہ سب کس جرم کی بنا پر؟ اس جرم کی بنا پر کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ـــ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا آقا صرف اللہ ہے۔ وَ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ۔ ہم اُسی کے احکام و قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، یہ مخالفت ہماری نہیں قرآن کی اس آواز کی ہے جسے بلند کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں۔ اور

قرآن کی انقلابی آواز

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ

زخمہ بر تار رگِ جاں می زند

وہ کسی انسان کا اقتدار و اختیار کسی دوسرے انسان پر رہنے نہیں دیتا۔ وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ

---

[1] ایک ملنے والے نے، جو کافی عرصہ کی سوچ بچار کے بعد، طلوع اسلام کی قرآنی فکر کی طرف آئے ہیں، مجھ سے یہ سوال کیا۔ وہ کہنے لگے کہ میں ایک عرصہ تک کیمونسٹ خیالات کا رہا۔ کھلے بندوں مذہب کے خلاف جو جی میں آتا کہتا تھا۔ اس وقت کسی نے بھی مجھے یہ نہیں کہا کہ تم کافر ہو۔ تمہاری بیوی تم پر حرام ہے۔ اب میں اسلام کا گرویدہ ہوں، اور مجھ پر یہ فتویٰ عائد کر دیا گیا ہے۔ تو میں پھر سے وہی کچھ کیوں نہ ہو جاؤں جو پہلے تھا تاکہ ان فتووں کی رد سے بچ کر مسلمان شمار ہونے لگوں؟ اسکا جواب یہی کافر گر حضرات دے سکیں گے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔؟

وہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائے۔ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا — خواہ وہ آسمانی حقوق کی مدعی ملوکیت ہو یا خدائی نیابت کی دعویدار پیشوائیت۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

بالفاظِ دیگر — موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — لہٰذا، جو قوتیں دوسروں کو اپنا محکوم اور غلام رکھنا چاہیں وہ قرآنی آواز کے عام ہونے کو کب گوارا کرسکتی ہیں۔ اندریں حالات، ان حضرات کی طرف سے اس فکر کی مخالفت قابلِ فہم ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

گرفتم حضرتِ مُلّا ترش روست — نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم — مرا از کعبہ می راند، حق اوست

قرآن کریم سے ان حضرات کی مخالفت (بلکہ معاذ اللہ نفرت) اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص یونہی بلا ارادہ کہہ دے کہ ہمیں اس معاملہ میں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، تو یہ تلملا اٹھتے ہیں اور شور مچا دیتے ہیں کہ یہ پرویزیت ہے، اور وہ بیچارہ ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ مجھ سے کیا قصور سرزد ہوگیا۔ یعنی اب یہ حضرات قرآن کریم کا نام تک سننا بھی گوارا نہیں کرسکتے۔ کتنی گہری نفسیاتی حقیقت تھی جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۱۷/۴۱)۔ ہم اس قرآن میں حقائق کے مختلف گوشوں کو لوٹا لوٹا کر لاتے ہیں، تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ لیکن اس سے ان کی نفرت اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔

ان کی ذہنی سطح

ان میں ایک طبقہ تو ان کا ہے جو دیدہ و دانستہ قرآنی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ ان سے ان کی مفاد پرستیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ وہ قرآنی حقائق کا ادراک کرسکیں۔ اس لئے ان کے نزدیک، صرف وہی شخص صحیح العقیدہ مسلمان ہوسکتا ہے جو ویسا ہی سوچے جیسا وہ سوچتے ہیں۔ وہی کہے جو وہ کہتے ہیں۔ جو انکی ذہنی سطح سے ذرا بلند ہو کر قرآن کریم کے متعلق غور و فکر کرے، وہ کافر ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا مصرف اتنا ہی ہے — کہ از یٰسین او آساں بمیری — انہی کے متعلق حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ

ز آنسوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزدِ او امّ الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملت از قال و اقولش فرد فرد

مکتب و ملّا و اسرار کتاب کور مادر زاد و نور آفتاب! (جاوید نامہ)

اقبال کے متعلق ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ دین کے متعلق وہ کیا جانتا تھا کیونکہ وہ ڈاڑھی منڈاتا تھا! یہ بات میں نے یونہی مزاحاً نہیں کہی۔ ان حضرات کے نزدیک خدا پرستی اور دین شناسی کا یہ اولین معیار ہے۔ پچھلے دنوں میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ

خدا پرستی کا معیار

جس لٹریچر کی بنا پر مجھے کافر قرار دیا جا رہا ہے اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس وقت ملک میں ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو اس لٹریچر کی بدولت اسلام کے گرویدہ ہیں۔ اور اگر یہ لٹریچر ان تک نہ پہنچتا تو وہ کبھی کے مغربی مادیت یا روس کی کمیونزم کے آغوش میں جا چکے ہوتے۔

اس پر ایک جریدہ میں، جو اس طبقہ کا نمائندہ ہے، لکھا گیا کہ

کیا جناب پرویز صاحب از رہ کرم ان ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے کسی ایک ایسے نوجوان کی بھی متعین طور پر نشاندہی کر سکتے ہیں (کہ وہ کون صاحب ہیں اور کس دنیا میں بستے ہیں) جو ان کا لٹریچر پڑھنے سے پہلے تو مادہ پرست اور ڈاڑھی منڈا ہو۔ مگر ان کا لٹریچر پڑھنے کے بعد خدا پرست بھی ہو گیا ہو اور ڈاڑھی بھی رکھ لی ہو۔[1]

(ایشیا۔ ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء)

لہٰذا، ان کے نزدیک، دین کے معاملہ میں اقبالؒ کا قول بھی کیا وزن رکھ سکتا ہے؟ اس لئے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ اس طبقہ کے علم دین کی حقیقت کیا ہے میں انہی میں سے دو ایک کی رائے پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مفتی محمد عبدہٗ مصر کے نامور عالم گزرے ہیں۔ یہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ جامعہ ازہر کے متعلق، جو اسلامی دنیا میں مذہبی علوم کی سب سے بڑی درسگاہ ہے، لکھتے ہیں

---

[1] یہ اخبار اس جماعت کا ترجمان ہے جو اپنے آپ کو ماڈرن اور لبرل خیالات رکھنے والی کہتی ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت میرا مقصد ڈاڑھی کے متعلق کوئی بحث چھیڑنا نہیں۔ نہ ہی ڈاڑھی رکھنے والوں کا کسی طرح استخفاف مقصود ہے۔ میرا مطلب صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک خدا پرستی کا معیار یہ رہ گیا ہے۔

جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیل علم کرتا ہے۔ اتنی ہی اُس میں تحصیل علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ (تفسیر المنار۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۸۱)

مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد، سید رشید رضا (مرحوم) اپنے استاد کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔

جب جامعہ ازہر کا یہ حال ہے، تو اُسی کے خطوط پر تشکیل، ہمارے ہاں کے دارالعلوموں کے متعلق بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) طبقۂ علماء کے سرخیل اور امام الہند سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف، تذکرہ میں علماء کی سیرت و کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے میں اس سے درگزر کرتا ہوں۔ ان کے علم کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کا انہی سے ظہور و نمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصول و اساس علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیا دی ان کی تحلیل و تفریق کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ الخالص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت اور عجمیت سے۔ کوئی شے اس سے نہ بچی حتیٰ کہ علماً علوم الہیہ و بلاغت و بیان۔ اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیر ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے، تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا جن کو یہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔

گذرے ہوئے لوگوں سے آگے بڑھیئے تو جو لوگ آج اس طبقہ میں موجود ہیں، وہ بھی اس تنقید میں ان سے پیچھے نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، طبقۂ علماء کے متعلق لکھتے ہیں

یہ طبقہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہوگئی ہیں ..... یہ لوگ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی

نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا جی چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیمیافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔

(تنقیحات صفحہ ۲۰)

آپ کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ جس درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد ان حضرات کو "عالم" ہونے کی سند ملتی ہے، قرآن کریم اس کے نصاب ہی میں داخل نہیں۔ صرف آخری سال، سورۂ بقرہ کی تفسیر بیضاوی (تبرکاً) پڑھا دی جاتی ہے۔ لہٰذا اس طبقہ کی طرف سے اگر قرآنی حقائق کی مخالفت ہوتی ہے تو یہ بچارے معذور ہیں۔ قرآنی حقائق کا ادراک ان کے بس کی بات نہیں۔

زخود رسیدہ چہ داند نوائے من ز کجاست
جہان او دگر است و جہان من دگر است

ان کا تصور وہ ہے جس کی طرف حضرت علامہؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

تیری نگاہ فسردہ مایہ۔ ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

جو بات ان کی ذہنی دسترس سے باہر ہو وہ ان کے نزدیک کفر ہوتی ہے۔ اور اس "کفر" کی مخالفت جہاد عظیم۔! اگر انہیں کہیں ایسی تعلیم مل جائے جس سے یہ قرآن کریم کا پیش کردہ تصور حیات اور اس کے حقائق و غوامض سمجھنے کے قابل ہو جائیں، تو پوچھئے نہیں کہ ان کی حالت کیا سے کیا ہو جائے!

مخالفت بربنائے جہالت

کیا جانئے کیا کہتا۔ کیا دیکھتا۔ کیا کرتا!
زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

جب قرآن کریم سمجھ میں آنے لگ جائے تو پھر انسان کا دامنِ نگاہ، چھوٹی چھوٹی جزئیات اور فرعی اختلافات میں الجھتا ہی نہیں۔ اس کی نظر بہت بلند اور اس کی فکر کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ دین کے جملہ اصول اور زندگی کے اہم عملی مسائل پر ہوتی ہے۔ وہ ہر اس شخص کو اپنے سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا ہے، جس کا رجحان ذرا سا بھی دین کی طرف ہو۔ اگر ان حضرات کو توفیق نصیب ہو کہ یہ قرآن کے حقائق سے بہرہ یاب ہو سکیں تو آپ احباب کو، سب سے زیادہ اپنے قریب پائیں۔ جس کی نگاہ قرآن پر ہو، اس کی تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو قرآن سے قریب ہو وہ اس کا عزیز ترین دوست اور رشتہ دار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں ان حضرات سے کہا کرتا ہوں

وہ تو وہ ہیں، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

لیکن مشکل یہ ہے کہ انہیں تعلیم ہی کچھ انداز کی ملتی ہے جس سے یہ خدا کی اس کتاب عظیم کی طرف آنے ہی نہیں پاتے۔ اور چونکہ انہیں بتایا یہ جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے مطابق نہ ہو جو تمہیں پڑھایا گیا ہے، وہ کفر اور باطل ہے، اس لئے یہ حضرات قرآن، اور قرآن پیش کرنے والوں کی اس طرح مخالفت کرتے ہیں۔

یہ ہے مخالفت کرنے والوں کا وہ گروہ جو بر بنائے جہالت قرآنی فکر کی مخالفت کرتا ہے۔ انہی کو وہ شاطر اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر قرآنی فکر و نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

لیکن یہ آواز دب نہیں سکتی

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی یہ آواز اب اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کا سیلِ رواں، مخالفت کی اس خس و خاشاک سے رُک نہیں سکتا۔

رہیں نہ رند۔ یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

جن سروں میں خدا کی اس کتابِ عظیم کا سودا سما جائے، ان کی زبانیں اس کے تذکرہ سے رک کیسے سکتی ہیں؟ ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

بڑھتا ہے ذوقِ گنہ یاں منع کے بعد

ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بلند و بالا مقصد کے حصول کے لئے وقف ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے ابدی حقائق تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے دنیا کے سامنے آ جائیں اور خدا کا متعین کردہ نظام، دنیا میں عملاً

متشکل ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی جن تاریکیوں میں اُبھر کر صحیح راستہ کھو چکی ہے، وہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت میں جانے کا کہکشانی صراطِ مستقیم مل جائے۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو اس کے لئے انہیں جو سزا بھی دی جائے یہ اُسے انتہائی مسرت سے برداشت کریں گے۔

آئے کچھ ابر۔ کچھ شراب آئے — اس کے بعد آئے' جو عذاب آئے
بامِ مینا سے ماہتاب اُترے — دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو — سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

اور اس طرح "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔" دنیا انہیں جو جی میں آئے کہے' ان کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ جب یہ بحضورِ رب محشور جائیں تو ان کا شمار اس گروہ میں نہ ہو جس کے متعلق حضور رسالتمآبؐ بدرگاہِ رب العزت شکایت کر رہے ہوں کہ

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)

(اے میرے پروردگار! یہ ہے میرے نام لیواؤں کی وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا یا اس کی آزادی سلب کر رکھی تھی)۔

آپ کو یاد ہوگا عزیزانِ من! اس حقیقت کا علم ہے کہ میں شروع سے یہ اعلان کرتا چلا آرہا ہوں کہ میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میں جو کچھ قرآن مجید سے سمجھتا ہوں اسے بلا کم و کاست دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے یا اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں۔ میرے اس اعلان پر میری تصانیف شاہد ہیں۔ میں ہمیشہ اربابِ نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ میری قرآنی فکر کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور اگر انہیں کسی جگہ کوئی سہو یا سقم نظر آئے تو اس سے مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں گا۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ صحیح اور

معیار قرآن ہونا چاہیئے

غلط کا معیار قرآن کریم ہو۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن پیش کرتا ہوں۔ اس لئے اسے قرآن ہی کی کسوٹی پہ پرکھنا چاہیئے۔ اگر میری کوئی بات قرآن کے خلاف ہے' اور کوئی جاہل اور عامی بھی اس کی نشاندہی کر دیتا ہے' تو میں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں۔ لیکن اگر کوئی فرد یا افراد کی جماعت ——— خواہ وہ گروہ کثیر ہی کیوں نہ ہو ——— یہ کہتی ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے معتقدات کے خلاف ہے' اس لئے غلط اور خلافِ دین ہے' تو میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ میں جس خدا پر ایمان لایا ہوں اس کا حکم یہ ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ

اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ (۷/۳) جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ اس کو چھوڑ کر اور سرپرستوں اور مددگاروں کی پیروی مت کرو۔ یہ ہے میرے نزدیک غلط اور صحیح۔ حق و باطل اور کفر و ایمان کا معیار۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو یہی لوگ کافر ہیں۔

میرے لئے حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔ اگر کسی کے نزدیک یہ "کفر" ہے تو مجھے اس "کفر" پر ناز ہے۔ خدا اس پر مجھے زندہ رکھے اور اسی پر موت دے۔

اب برادرانِ عزیز! دوسری طرف آئیے۔ میں نے جو کہا ہے کہ فطرت بعض اوقات، خود مخالفین کی مخالفت سے بھی تائید کا کام لے لیتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ احباب، قرآنی آواز کے پھیلانے کے سلسلہ میں اپنی سعی و کاوش میں سست رو ہو جائیں۔ قطعاً نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ ٹھوکر (FALL) نہر کے پانی کی رفتار کو تیز کر دیتی ہے، لیکن اسی نہر کی رفتار کو جس کا پانی ٹھوکر کو پھاند کر آگے بڑھ جائے۔ اگر نہر کے پانی کی سطح ٹھوکر کی بلندی سے نیچی ہو تو وہ نہر جوہڑ بن جاتی ہے اور اس کی روانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مخالفت کی تیزی کے ساتھ آپ کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی جائیں۔

آپ کا کام

اس ضمن میں عزیزانِ من! میں ایک اہم نقطہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے جو حضرات کچھ عرصہ سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ تو اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں، لیکن نو وارد احباب جو ایک خاص ولولہ لے کر شریکِ محفل ہوتے ہیں، انہیں اس نقطہ کے سمجھنے میں ذرا دقت لگتا ہے۔ جو کچھ میں اس مقام پر کہنا چاہتا ہوں اس کا اولین مخاطب یہی طبقہ ہے۔ ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں، ہمارے ہاں ہنگامی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں نے اس قسم کا تصور عام کر رکھا ہے کہ جس پروگرام میں ہنگامہ خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں، وہ پروگرام عملی نہیں ہوتا۔ عملی پروگرام کے لئے، بگولوں کا سا رقص، اور طوفان کا سا جوش و خروش ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد تحریک ہے جس کا مقصد لوگوں کے قلب و نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس نے قرآن کریم کی تعلیم سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)۔ جب تک کسی قوم میں نفسیاتی تبدیلی

عملی پروگرام

نہیں ہوتی اس کی حالت نہیں بدل سکتی۔ طلوعِ اسلام کا مقصد، قوم میں اس نفسیاتی تبدیلی کا پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد ہنگامہ آرائیوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ خاموش لیکن استقامت آمیز تبلیغ سے ہو سکتا ہے۔ لاہور کا تو مجھے علم نہیں، لیکن کراچی میں، برسوں تک ایک عجیب منظر دکھائی دیتا رہا۔ شام کے وقت، شہر کی سب سے بارونق سڑک الفنسٹن سٹریٹ کے چوراہے پر، ایک کونے میں، ایک یورپین نوجوان خاموش کھڑا دکھائی دیتا۔ عمدہ سوٹ میں ملبوس۔ ایک تھیلا گلے میں لٹکائے، اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ لئے، خاموش کھڑا ہے ___ خاموش، پتھر کے بت کی طرح خاموش۔ دو دو، تین تین گھنٹے ہر روز اسی طرح کھڑا رہتا۔ اگر کسی نے آگے بڑھ کر پمفلٹ مانگا تو اس نے

خاموش تبلیغ

زبان سے ایک لفظ کہے بغیر، ہاتھ والا پمفلٹ اسے دیدیا، اور ایک اور پمفلٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اُسے، ہفتوں، مہینوں۔ برسوں اسی طرح دیکھا ___ اس قسم کے اور نوجوان بھی شہر کے مختلف مقامات پر اسی طرح کھڑے ملتے۔ یہ ایک عیسائی تبلیغی ادارہ کے مشنری تھے۔ لوگ ان کی اس "بے معنی" حرکت کا مذاق اڑاتے، لیکن جب ان کی رپورٹ شائع ہوئی تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کی وہ خاموش تبلیغ کس قدر گہرا اور وسیع اثر کرتی جا رہی تھی۔ وہ درحقیقت اس طرح متجسس لوگوں کا رُخ اپنے مرکزی ادارہ کی طرف موڑ دیتے تھے۔

ہمارے سامنے بھی برادرانِ عزیز! اسی قسم کا پروگرام ہے۔ ہمارا مقصد قرآنی تعلیم کی تبلیغ ہے۔ یعنی اس فکر کو خود سمجھنا اور سمجھنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا ___ لٹریچر کے ذریعے پہنچانا، اور معاملات میں اپنے حسنِ کردار کے ذریعے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ اس پروگرام کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ یہ ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآنی پروگرام اور اُن خاموش مشنریوں کے پروگرام میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ خاموش کھڑے رہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یہ زندگی کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہے، اور عیسائیت کی خصوصی تعلیم۔ قرآن، مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو سامنے لاتا ہے اور اسی کو صحیح طریق قرار دیتا ہے۔ یہ وہ طریق ہے جو ملتِ اسلامیہ کے مؤسس حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے اس وقت ملا جب آپ نے، قوم کی حالت سے شدید طور پر متاثر ہو کر، بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۔ مجھے بتا کہ اس قسم کی بے حس اور مردہ قوم کس طریق سے زندہ ہو گی؟ وہ طریق کیا تھا؟ یہ کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ۔ یعنی وہی طریق جس سے وحشی پرندوں کو سدھایا

ہمارا پروگرام

جاتا ہے۔ ان پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کے سائے سے دور بھاگتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور وہ جھٹ سے اڑ گئے۔ ان پرندوں کو سدھانے کے لئے خاموش کھڑے

رہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ انہیں حسن سیرت سے اپنے ساتھ اس قدر مانوس کرنا پڑتا ہے کہ آپ انہیں کھلی فضاؤں میں چھوڑ کر جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا (۲/۲۶۰)۔ آپ کی آواز پر وہ دوڑتے ہوئے آپ کی طرف آجائیں گے۔ یہ مثبت پروگرام ہے۔ لیکن اس میں ہنگامہ آرائی کا کوئی دخل نہیں —— دخل تو ایک طرف، اگر انہیں سدھانے کے دوران میں کہیں ذرا سی آہٹ ہو جائے۔ یا آپ سے کوئی خلاف معمول اور غیر مانوس خفیف سی حرکت سرزد ہو جائے، تو وہ فوراً بدک جائیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے نہایت صبر و سکون کے ساتھ، ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ندی کی سی روانی اور چٹان کی سی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہی ہمارا پروگرام ہے اور اسی پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔ اس تبلیغ کے ذرائع میں عند الضرورت، اور حسب اقتضائے وقت تبدیلی آتی رہے گی، لیکن کسی کی بے تابئ تمنا کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہمارے پروگرام میں ہنگامہ آرائی کا دخل کبھی نہیں ہوگا۔ جو احباب، اس پروگرام میں شریک ہونا چاہیں، انہیں اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں پروانے کی طرح جلنا ہے۔ مرغ سحر کی طرح شور مچانا نہیں۔

ضدی لوگ

اس سلسلہ میں ایک اور ضروری بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ —— اور ان کا تعلق بیشتر قدامت پرست مذہبی طبقہ سے ہوتا ہے —— کہ تعصب۔ ضد اور ہٹ دھرمی جنکا شعار ہوتا ہے، اور انہوں نے پہلے ہی سے فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کی سننی ہی نہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ جو لوگ پہلے ہی سے فیصلہ کئے بیٹھے ہوں کہ کچھ بھی ہو ہم نے کسی کی بات ماننی ہی نہیں۔ انہیں اُن کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ کبھی صداقت کی بات نہیں مانیں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۷۳/۱۰) ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔ اس قسم کی جامد، متعصب، ضدی ذہنیتوں کے سامنے قرآنی فکر پیش کرنے میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ذرا دقت نظر سے کام لیا جائے تو ایسے لوگوں کو پہچاننے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مے من از تنک جاماں نگہدار — شراب پختہ از خاماں نگہدار
شرر را از نیستانے دور تر بہ — بہ خاصاں بخش و از عاماں نگہدار

قرآنی فکر کو ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو زندگی کے عملی مسائل پر غور و فکر کرنے اور علم و بصیرت کی رو سے انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزومند ہوں۔ قرآن کا خطاب ہی اُن لوگوں سے ہے جن میں زندگی کی کچھ رمق اور حرارت ہے۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ یہی وہ زمین ہے جس میں اس فکر کا تخم صالح شجرِ طیب بن کر پھوٹتا پھلتا ہے، اور انہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہمارے نادان دوست

دوسری بات جس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے، اس سے بھی اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ دانا دشمن کس طرح اچھا ہوتا ہے، اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن نادان دوست کس قدر نقصان پہنچاتا ہے اس کا تجربہ مجھے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے یہ "نادان دوست" ہماری تحریک سے وابستہ ہیں۔ بعض ان میں سے بزموں کے ممبر بھی ہیں۔ طلوع اسلام باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لٹریچر کا مطالعہ کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ لیکن حالت ان کی یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی تحریک، اس کی پیش کردہ قرآنی فکر اور خود میرے متعلق ایسے ایسے عقائد و نظریات لوگوں سے بیان کرتے ہیں، جنہیں سن کر میں محوِ حیرت رہ جاتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ

خدا مجھے میرے ان دوستوں سے بچائے

میرا اندازہ ہے کہ آپ کی تحریک کو اتنا نقصان آپ کے مخالفین کے سب و شتم سے نہیں پہنچا جتنا ان متفقین کی نوازشہائے بیجا سے پہنچتا ہے۔ یہ حضرات تحریک کے لئے بڑے ہی خطرناک واقع ہوتے ہیں اور ان کی اس حرکت کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ

(۱) جب آپ سے کوئی شخص، تحریک، اس کے نظریات یا میرے عقائد و مسلک کے متعلق کچھ پوچھے تو یہ دیکھئے کہ اس کا جواب ادارہ کی شائع کردہ کسی کتاب، رسالہ یا پمفلٹ میں ہے۔ اگر ہو تو دریافت کرنے والے سے کہیئے کہ میں فلاں تحریر آپ تک پہنچا دوں گا۔ اس میں آپ کو اس کا جواب مل جائے گا۔

(۲) اگر آپ کی دانست میں، اس کا جواب شائع شدہ لٹریچر میں نہ ہو، تو ان سے کہہ دیجئے کہ مجھے

اس کے متعلق علم نہیں۔ ادارہ کا یہ پتہ ہے۔ آپ ان سے براہ راست دریافت کرلیں۔

مختصراً یہ کہ آپ اپنی طرف سے اس قسم کے سوالوں کا جواب بالکل نہ دیجئے۔ سند تحریر کی ہے۔ اس کے سامنے تحریر پیش کیجئے۔ زبانی باتیں "روایات" کے تابع آجاتی ہیں۔ "روایات" میں نہ اُلجھئے۔

میں مختلف بزموں کے نمائندہ حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ براہِ کرم اپنے اراکین پر اس سلسلہ میں کڑی نگاہ رکھیں اور اگر کوئی رکن اس کی خلاف ورزی کرے تو اس سے مواخذہ کریں۔ اگر کوئی رکن تنبیہ کے باوجود اس سے باز نہ آئے، تو سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ شامل ہی آپ کی تحریک کو نقصان پہنچانے کے لئے ہوا ہے۔ تحریک کو اس سے بچاتے رہئے۔

اس مقام پر میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ طلوع اسلام صرف ان باتوں کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ کسی بات کا ذمہ دار نہیں، خواہ اُسے، کوئی بھی اُس کی طرف منسوب کیوں نہ کرے۔

ہماری عملی زندگی

اب میں عزیزانِ من! اس خطاب کے سب سے اہم گوشے کی طرف آتا ہوں۔ آپ، قرآنی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ بڑی مبارک بات ہے۔ لیکن قرآن کریم کا سمجھ لینا مقصود بالذات نہیں۔ اسے سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر قرآن کریم کا صحیح مفہوم ہماری سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، تو یہ ذہنی تفریح سے زیادہ کچھ نہیں اگر اس سے، ہمارے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ایسا انقلاب پیدا نہیں ہوتا جس کی جھلک ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ پائی جائے۔ تو ایسی قرآن فہمی محض شاعروں کی داد ہے ــــ جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل و نگاہ کی اس مسلمانی کا مظاہرہ ہماری رفتار و گفتار و کردار سب میں ہونا چاہیئے۔ اگر ہماری سیرت پاکیزہ نگاہ بلند۔ کردار پختہ۔ اور معاملات صاف نہیں، تو ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے۔ جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تعلیم کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیں کہ ہم ان سے بہت آگے ہیں کیونکہ ہم قرآنی تعلیم کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔ قرآن سمجھنے والوں کی زندگیاں ایسی ہونی چاہئیں جن سے وہ چلتے پھرتے دوسروں سے ممتاز و متمیز نظر آئیں، اور جس کسی کو ان سے کبھی

واسطہ پڑے، وہ ان کے حسن معاملہ سے متاثر ہو کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ — دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال

— اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پیش نظر پورے کے پورے معاشرہ میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک معاشرہ میں ایسا انقلاب نہ آجائے، ہم اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ غلط معاشرہ کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر انفرادی طور پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے، لیکن زندگی کے جن دائروں میں ہم مجبور نہیں، وہاں کونسی چیز مانع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے اندر حسن سیرت پیدا نہ کریں؟ اپنی ہر کمزوری کے لئے، معاشرہ کی مجبوری کو سپر بنا لینا، بہت بڑی خود فریبی ہے۔ قرآن کا نام لینے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں مبتلا رکھیں۔ صداقت۔ اخوت۔ محبت۔ شفقت۔ حسن معاملہ۔ ایفائے عہد۔ کشادہ نگہی۔ وسعت نظر۔ تحمل۔ بردباری۔ پاکیزگی خیالات۔ عفت قلب و نگاہ، ہمارے امتیازی نشانات ہونے چاہئیں۔ میں نے ان چند خصوصیات کا ذکر محض مثال کے طور پر کیا ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ ہماری ساری زندگی سیرت محمدیہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہیئے، کہ قرآن فہمی کا فطری نتیجہ یہی ہے۔

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا رہن سہن نہایت پروقار اور سنجیدہ ہو، اور ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ آپ چلتے پھرتے شریف انسان دکھائی دیں، جو خود بھی امن و سلامتی میں رہیں اور دوسروں کے لئے بھی امن و سلامتی کے پیامبر اور آرزومند ہوں۔ آپ کے ہاتھوں سے کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ اس کے برعکس، عدل اور احسان آپ کا شیوۂ زندگی ہو۔

پاکستان کا استحکام

یہ بھی ضروری ہے کہ آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطۂ زمین کے استحکام میں ضعف آنے پائے۔ اس لئے کہ ہماری درخشندہ امیدیں اور تابناک آرزوئیں اسی خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصور عام کر رہے ہیں، اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہو سکے گی۔ عام لوگوں کے لئے یہ خطۂ زمین محض ایک ملک ہے لیکن ہمارے لئے قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ، اور نوع انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ۔ اس سے ہمارے نزدیک اس کی سالمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ہمارے ایک طرف ہندو جیسے تنگ نظر دشمن کے مذموم عزائم ہیں جو اپنی کئی صدیوں کی غلامی اور محکومی کا انتقام ہم سے لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف روسی کمیونزم کا بلائے بے درمان ہے کہ

ہیں سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

پھر خود ملک کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں، جو تحریک پاکستان کے سخت دشمن تھے اور جواب مقدس نقابوں کی اوٹ میں، ملک میں تخریب و انتشار پیدا کر کے اپنی شکست پندار کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ طلوع اسلام کے خلاف ہنگامہ آرائی میں دیکھئے کتنا بڑا عنصران گروہوں کا ہے جن سے یہ تحریک پاکستان کے زمانے میں نبرد آزما تھا کیونکہ وہ اس تصور کی مخالفت کرتے اور اسے دین کے خلاف بتاتے تھے۔ ان کے سینے میں وہی پرانے زخم ہیں جو اب تک مندمل نہیں ہو سکے۔ یہ لوگ آپ کو ہر طرح سے اشتعال دلائیں گے۔ لیکن آپ نے ضبط کے دامن کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ہے۔ یہ امر موجب ہزار مسرت و اطمینان ہے کہ گذشتہ دنوں آپ کی تحریک کے خلاف جو ہنگامہ آرائی کی گئی اور آپ احباب کو بری طرح اشتعال دلایا گیا اس میں کسی ایک جگہ بھی صبر و سکون کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ میں آپ احباب کو اس پر دلی مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں۔

اشتعال انگیزی

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری دعوت، فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے خلاف مسلسل جہاد ہے کیونکہ قرآن میں نفرقہ ہے — خواہ وہ مذہب کے نام سے ہو یا سیاست کے — دین کی یکسر نقیض ہے۔ دین وحدت انسانیت کا علمبردار ہے جس کی منزل اول وحدت امت ہے۔ اس لئے آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ چونکہ عملی سیاست میں حصہ لینا ہمارے پروگرام میں نہیں، اس لئے ہمیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے سامنے تو بس ایک ہی پروگرام ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر خود بھی سمجھیں اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ اور اس کے مطابق اپنے انفرادی اور زندگی انسیا دائمت کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتے جائیں جس سے ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط پر تشکیل ہو سکے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ

فرقہ بندی اور پارٹی بازی

نہ از ساقی، نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم

جو کچھ میں پیش کرتا ہوں، اس میں اگر سہواً کوئی ایسی بات آ جاتی ہے جو قرآن کریم کے منشا کے مطابق نہیں تو زمانہ اسے خود بخود مٹا دے گا۔ جو کچھ قرآن کے مطابق ہے، وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود زندہ

محو و ثبات کا قانون

رہے گا اور آگے بڑھے گا۔ اس لئے کہ کائنات میں محو و ثبات، خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ○ (۱۳/۳۹)۔ اس لئے اگر ہماری کوئی بات قرآن کے مطابق ہے اور ہمارا زمانہ اسے قبول نہیں کرتا تو آنے والا زمانہ اسے قبول کرے گا۔ اگر میری بات حق پر مبنی ہے تو مجھے یقین ہے کہ

روشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے
پھر بھی سمجھو کہ ابھی تک میرا افسانہ ہے

میں نے برادرانِ عزیز! پچیس تیس برس اُدھر اپنے سامنے جو قرآنی پروگرام رکھا تھا، میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود، اس کی ایک ایک کڑی، یوں پوری ہوتی گئی کہ جب میں اپنی قطع کردہ منزل پر نگاہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ یہ کیسے طے ہو گئی۔ اس کے لئے میں جہاں بدرگاہِ صمدیت قدم قدم پر سجدۂ تشکر و امتنان ادا کرتا ہوں وہاں آپ مخلص احباب کی بے لوث

سپاس گزاری

رفاقت اور بے پناہ محبت کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار ہوں کہ آپ کی رفاقت کے بغیر، یہ طول طویل اور دشوار گزار منزل کبھی طے نہ ہو سکتی۔ میں نے اب تک جو کچھ پیش کیا' وہ ملک کے اردو داں طبقہ تک محدود تھا۔ اب میں اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور نہ صرف اپنے ملک

انگریزی لٹریچر

کے انگریزی خواں طبقہ تک ہی اس آواز کو پہنچانا چاہتا ہوں، بلکہ یورپ اور امریکہ کے ان مفکرین اور مدبرین کو بھی اس کے دائرے کے اندر لانا چاہتا ہوں جو قرآنی نظام و تصورات کو سمجھنے کے لئے ہمہ تن شوق نظر آتے ہیں۔ اور جن کے تقاضے اب اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ انہیں زیادہ عرصہ تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ آپ احباب یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اس سلسلہ میں بھی کام شروع ہو چکا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیراً۔

درسگاہ کا قیام

اس کے بعد، میرے پروگرام کی اہم (اور شاید آخری) کڑی ایک ایسی درسگاہ کا قیام ہے جس میں قوم کی نئی نسل کا قلب و دماغ صحیح قرآنی قالب میں ڈھل سکے اور ان کی صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پا کر انسانیت کی فوز و فلاح کے کاموں میں صرف ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ پروگرام بڑا ہمت طلب اور وسیع ذرائع کا متقاضی ہے۔ لیکن

بے دست و پا نیم کہ ہنوز اند فورِ عشق
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

میری ساری عمر اور اس کے عزائم اس ایک یقینِ محکم کے سہارے زندہ و پائندہ رہے ہیں کہ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

میرے سامنے جب بھی کوئی نیا پروگرام آیا، میرا انداز یہی رہا ہے کہ اس کے لئے جس قدر اسباب و ذرائع میسر آئے انہیں لے کر میں اس ربِ کریم کے آستانِ عالیہ پر جھولی پھیلا کر حاضر ہو گیا۔ اس درخواست کے ساتھ جو حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش کی تھی کہ

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا (۱۲/۸۸)

ہم یہ حقیر سی پونجی لے کر حاضر ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔ ہم اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں مانگتے۔ آپ اسے قبول کر لیجئے اور ہمیں ہماری ضرورت کے مطابق غلہ دے دیجئے۔

اور میں نے دیکھا ہے کہ اس بارگاہ عاجز نواز نے مجھے کبھی مایوس نہیں لوٹایا۔ لیکن اس سے بھی بڑی حوصلہ بخش تعلیم وہ ہے جو (نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے) ہمیں دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہارا کام اپنے فریضہ کی ادائیگی ہے۔ یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں کہ اس کے نتائج کب مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ہو گا

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (۱۳/۴۰)

اس لئے ہمیں اس کی فکر کیوں ہو کہ ہمارے پیشِ نظر پروگرام کی تکمیل کب ہو گی۔ ہم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ

در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

ہمیں نتائج سے بے پرواہ، اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ اگر ہمارا پروگرام قانونِ خداوندی کے مطابق ہے۔ ہمارے ارادے نیک اور ہمت میں استقامت ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زود یا بدیر اس کے خوشگوار نتائج مرتب نہ ہوں۔ لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (۱۲/۵۶)۔ اس خدا کا ارشاد ہے جس کا ہر وعدہ سچا ہوتا ہے۔ باقی رہیں آپ کی تصورِ حیات و نظام کی مخالفتیں، تو ان سے آپ قطعاً متاثر نہ ہوں۔ میری نگاہیں افقِ عالم پر ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے غلط نظام ہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح ایک صحیح نظامِ زندگی کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ خدا کا نظام زمان اور مقام میں محدود نہیں۔ اس کا خطاب سارے عالمِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے کسی ایک مقام میں اس کی مخالفت، اس کے راستوں کو مسدود نہیں کر سکتی۔

زمانے کے تقاضوں کو کوئی قوت روک نہیں سکتی ۔ آپ قرآنی آواز کی مخالفت کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۲/۲۱)

میں نے برادرانِ عزیز! سردست جو کچھ آپ سے کہنا تھا، کہہ چکا۔ میں ایک بار پھر آپ احباب کی خدمت میں، اس حسین و سادہ اجتماع میں شرکت کے لئے ہدیہ سپاس گزاری پیش کرتا ہوا دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کے ارادوں میں برکت ۔ دلوں میں اخلاص ۔ بازوؤں میں ہمت اور پاؤں میں استقامت عطا فرمائے، اور زندگی کے جس درخشندہ و تابناک مقصد جلیل و جمیل کو لے کر آپ اٹھے ہیں خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید آپ کے شاملِ حال ہو، اور آپ تمام موانع پر قابو پاتے ہوئے اس راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یارب این آرزوئے من چہ خوش است

آپ یہاں آئے ہیں تو اس ولولہ کو لے کر کہ

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دیں
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دیں

اور جب یہاں سے جائیں تو اس عزم بلند کو ساتھ لے کر کہ

یہ خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ خوں سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ۝ (۳/۸)

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۲/۲۵۰)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (۲/۱۲۷)

وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ

سینکڑوں دہریے اور کمیونسٹ

نوجوان، جو مذہب سے برگشتہ ہو چکے تھے ان دو کتابوں کے پڑھنے سے
اسلام کے گرویدہ ہو گئے یعنے

سلیم کے نام خطوط

جن میں ان تمام سوالات کا نہایت مدلل، اطمینان بخش اور بصیرت افروز جواب دیا گیا ہے جو ہمارے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انداز بیان نہایت شگفتہ اور دل نشین ہے۔ یہ خطوط نہیں، بلکہ اسلام کا انسائیکلوپیڈیا ہے

قیمت جلد اول - آٹھ روپے - جلد دوم - چھ روپے - جلد سوم - چھ روپے

دوسری کتاب کا نام ہے

انسان نے کیا سوچا؟

سقراط اور افلاطون سے لے کر برٹرینڈ رسل اور ٹوئن بی تک، مختلف مفکرین، مدبرین، مورخین اور سائنسدانوں نے کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں انہیں اس انداز میں سامنے لایا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ انسان وحی کی راہ نمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ عجیب و غریب کتاب ہے۔

قیمت ——— بارہ روپے

ملنے کا پتہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۳۷- بی شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

مثالی مملکت

محترم پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن (سنہ ۱۹۶۳ء) سے خطاب کیا

شائع کردہ
ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثالی مملکت

(IDEAL STATE)

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اُس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے، دور سے بھی، اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں، اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ عہدِ قدیم کے کسی سیاستدان یا مفکر کے نہیں، جو اس نتیجہ پر اُس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اسے اُن نظامہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اُس کے سامنے، بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک ماہرِ سیاست، (H. J. MENCKEN) کے ہیں، جنہیں اس نے

اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT & WRONG) میں عہد قدیم سے لے کر عصر حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت، کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ اس میں مغرب کا وہ جمہوری نظام بھی شامل ہے

جمہوری نظام

جو اس وقت تک کی فکرِ انسانی کی آخری ایجاد ہے، اور جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے (یا بڑا ناز تھا) اس سب سے آخری نظام کے متعلق پروفیسر مذکور لکھتا ہے کہ

> ان مختلف، اسالیب حکومت میں، سب سے زیادہ ناکام، نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، یہ لوگ ان عناصر کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، لامتناہی عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔

مغرب کے جمہوری نظام کی ناکامی کی اصلی وجہ کیا ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں دیکھیں گے۔ سردست، صرف اتنا دیکھئے کہ، مورخین اور مفکرین کی رائے یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے پانچ چھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر اسالیب حکومت وضع کئے ہیں، ان میں ایک بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ سب ناکام رہے ہیں۔ میں نے "مورخین اور مفکرین" اس لئے کہا ہے کہ انسان نے سابقہ نظامہائے حکومت کے ناکام تجارب کے بعد جس جمہوری نظام کو اختیار کیا تھا اس کے ہاتھوں یورپ کے قریب قریب تمام ارباب فکر و نظر تنگ آ چکے ہیں، اور اس کی بجائے کسی بہتر نظام کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہے ہیں (تفصیل ان امور کی میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی)

سوال یہ ہے کہ انسان نے، اتنے طول طویل عرصہ میں، اس قدر مختلف اور متنوع تجربے کئے، تو اس کی کیا وجہ تھی کہ ان میں کوئی تجربہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ سب ناکام رہ گئے۔

ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

انسان کی اس مایوس کن ناکامی کے اسباب و وجوہات کی تفصیل میں جائیں تو معلوم داستان کس قدر طویل ہو جائے، لیکن اسے اگر چند لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو اس ناکامی کی بنیادی وجہ سامنے آئے گی، کہ انسان نے جو نظام حکومت بھی وضع کیا، اس میں حکومت کا اختیار (اقتدار) انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مختلف زمانوں میں حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں، لیکن روح، ہر جگہ یہی کارفرما رہی۔ وہ قدیم ترین زمانہ کا قبائلی نظام تھا، یا بعد کا شاہنشاہی نظام۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے سہاروں پر قائم شدہ

خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل نظام تھا، یا خدا کو حدودِ مملکت سے باہر نکال کر سیکولر انداز کا نظام۔ وہ عصرِ حاضر کا ڈکٹیٹر شپ کا نظام تھا یا انسانی ذہن کی آخری تصنیف، جمہوری نظام۔ ان سب میں ایک ہی حقیقت کارفرما رہی اور کارفرما ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں حکومت کا اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں تھا ـــــ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت۔ اس نے قوتِ بازو سے سلطنت حاصل کی ہو یا وہ لوگوں کا منتخب کردہ ہو۔ اس کا نتیجہ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں یہ کہ

> تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتلائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے وہ آج نہیں ہوگا یا آئندہ بھی ایسا ہی نہیں ہوتا رہے گا۔
>
> (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE)

"تشکیلِ انسانیت" کا مصنف 'برفو' اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

> ## نشۂ اقتدار کی بدمستیاں
>
> یہ بیماری لازمی اور لاعلاج ہے۔ ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، جب اقتدار ہاتھ میں آجائے تو اس کے مہلک اثرات سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ نشۂ اقتدار وہ بلا ہے جس سے انسانی قلب کی ہر حرکت الٹی ہو جاتی ہے۔ ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ہر نقطۂ نگاہ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر فیصلہ میں ذاتی رجحانات کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں تعصب دخیل ہو جاتا ہے۔ تمام ذہنی سکّے فریب کے ٹکسال میں ڈھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر فریبِ اقتدار دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہمارا حکیمِ مشرق ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

> اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں ـــــ سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
> تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے ـــــ صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
> اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ـــــ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

"اسکندر و چنگیز" کی طرف اشارہ کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ انسانیت کی یہ تباہیاں، صرف شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں سے آئی ہیں۔ جمہوری حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

سوال شخصی اور جمہوری حکومت کا نہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، استبداد ہے۔ طاقت تو ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت، عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے.... یہ انکشاف آج کا نہیں، بہت قدیم ہے کہ اقتدارِ مطلق بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوت، انسان کو خراب کر دیتی ہے، اور مطلق قوت، اسے بالکلیہ خراب کر دیتی ہے.... نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو، اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی۔ دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی۔ دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہر حال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے.... اور ان سب میں، سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت، محض اپنی تعداد کے زور پر، اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (برفو۔ تشکیلِ انسانیت)۔

کمیونزم یورپ کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے خلاف کمیونزم نے آواز بلند کی تھی اور دنیا کے مزدوروں کو پکار کر کہا تھا کہ اس لعنت کے خلاف متحدہ طور پر محاذ قائم کرو۔ اس میں سوائے تمہاری زنجیریں ٹوٹ جانے کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جور و استبداد کے ستائے ہوئے انسانوں نے، اس آواز کو نوید مسیحا سمجھا اور اس آئینِ نو کو گلے سے لگایا۔ لیکن تجربہ نے جلد ہی بتا دیا کہ کمزوروں کو آزادی اس سے بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

لارڈ رسل اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ

حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو نوعِ انسان کا

خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔

(THE NEW WORLD)

اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ کوئی قابلِ اطمینان نظامِ حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن ہربرٹ اسے انسان کی بدفطرتی پر محمول نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی نظریہ کو دہراتا ہے کہ

> قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہر شخص فطرۃً بد واقع ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ قوت کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنے پانچ چھ ہزار سال کے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب تک اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں رہے گا (خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت)، دنیا میں اطمینان بخش نظامِ تمدن و مملکت قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایسے نظام کے قیام کے لئے اولیں اور بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اور اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ جس نتیجے پر انسان، اتنے طویل المیعاد تجربات، اور اس قدر جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کے بعد پہنچا ہے، جس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے اسے اس قدر خون کے دریا بہانے اور آگ کی خندقیں پیرنی پڑیں، جس کے لئے انسانیت صدیوں تک تڑپتی، پھڑکتی، کٹتی، جلستی، اور ذبح ہوتی رہی۔ کیا یہ آواز اس سے پہلے بھی کہیں سے سنائی دی تھی، اور اگر سنائی دی تھی تو اس نے کیا نتیجہ پیدا کیا تھا؟ ہاں! یہ آواز آج سے قریب ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کی سرزمین میں، جہاں اس سے پہلے علم و بصیرت کی کرن تک کا گزر نہیں ہوا تھا، ایک

زبانِ وحی کا اعلان

صحرانشینؐ کی زبان سے بلند ہوئی تھی جس نے وحیِ خداوندی کے الفاظ میں ساری دنیا کو للکار کر کہا تھا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)۔ حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس حق میں کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم کائنات کی ساری مخلوق میں، انسان کا مقام سب سے اونچا ہے۔ جب انسان اس حقِ خداوندی میں شریک نہیں تو اس کے بعد اس میں اور کون شریک

ہوسکتا ہے۔

برگسان نے کہا تھا کہ

> مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ، انسانوں پر نہیں بلکہ اشیاء پر ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ ہو۔

(THE TWO SOURCES OF MORALITY & ReLIGION)

جہاں تک اشیائے کائنات پر اقتدار کا تعلق ہے' زبانِ وحی نے انسانوں سے کہہ دیا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ خدا نے سب کو، اپنے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ تاکہ انسان، ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ آدم کے سامنے ملائکہ کے سجدہ ریز ہونے سے مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان، کائنات کی ہر قوت کو مسخر کر سکتا ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات پر انسان کا کلی اقتدار ہے۔ لیکن جہاں تک خود انسانوں کا تعلق ہے خدائے کائنات نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ... (۳/۷۹)۔ کسی انسان کے شایانِ شان نہیں کہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین۔ ان قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار اور نبوت تک بھی دیدے تو وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کی محکومی کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔۔۔ اسے پھر سن لیجئے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ دنیاوی حکومت کی مسندوں پر براجمان ہو جانے والے تو ایک طرف رہے کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔ وہ یہی کہے گا کہ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ (۱۹/۳۰) میں خود خدا کا محکوم ہوں۔ اِس لئے مجھے حقِ حکومت کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

لیکن انسانوں پر نہیں

برادرانِ عزیز! غور کیجئے۔ اس سے بڑا انقلابی اعلان، کائنات کی فضاؤں میں کہیں اور بھی سنا گیا ہے؛ وہ اعلان جس نے اس تصور کو یکسر باطل قرار دے دیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اِس اعلانِ عظیم نے، انسانوں کے خود ساختہ ایوانہائے حکومت و سطوت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا اور غلامی اور محکومی کی ان تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ جن میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آ رہی تھی۔ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ خواہ یہ زنجیریں، دنیاوی حکمرانوں کے تغلب و تسلط نے انسانوں کی گردن میں ڈال رکھی ہوں' اور خواہ مذہبی پیشوائیت نے تقدس و عقیدت کے ہاتھوں انہیں لوگوں کے دل و دماغ کے گرد لپیٹ رکھا ہو۔ اس زلزلہ انگیز اعلانِ حریت نے ان تمام زنجیروں کے ٹکڑے

ٹکڑے کر دیئے اور انسان کو دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔

خدا کی حکومت سے مفہوم

یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ "خدا کی حکومت" سے مفہوم کیا ہے؟ خدا نہ کسی کے سامنے آتا ہے۔ نہ اُس کا تختِ حکومت کہیں بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ نہ کسی نے اُسے کوئی حکم دیتے دیکھا ہے۔ نہ اُس کی آواز سنی ہے۔ پھر اُس کی حکومت کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس سے مراد انسانوں کا 'خدا کے نام پر حکومت' کرنا ہے؟ کیا اس سے مطلب یہ ہے کہ بعض انسانوں کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اگر یہی مطلب ہے تو، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس سے بڑھ کر انسانی استبداد اور سخت گیری کی مثال کسی اور اندازِ حکومت میں نہیں ملیگی۔ انسان نے جس قدر، خدا کا نام لے کر، دوسرے انسانوں کو ستایا ہے، شیطان کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ نمرود و فرعون، اور ہلاکو اور چنگیز نے اگر انسانوں پر مظالم روا رکھے تو دنیا آج تک ان کا نام لعنت اور پھٹکار سے لیتی ہے، لیکن جن "مقدسین کے طائفہ" نے، ان سے کہیں زیادہ، انسانیت کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے، ان کے مجسمے پرستش گاہوں میں نصب کئے گئے۔ لہٰذا، خدا کی حکومت سے یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ قرآن جو کسی نبی تک کو انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیتا، عام انسانوں کو اختیاراتِ خداوندی استعمال کرنے کا حق کیسے دیدے گا؟

انسانی اقتدار سے مراد

آپ دیکھئے کہ انسانی اقتدار و اختیار سے مراد کیا ہے؟ انسان دوسرے انسانوں پر کس طرح حکومت کرتا ہے؟ آپ عہدِ قدیم کے بے آئینی کے دور کو چھوڑیئے جب ایک انسان محض قوت کے زور پر دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہمارے زمانے میں، یہ حکومت "قانون" کے ذریعے ہوتی ہے۔ جس انسان، یا انسانوں کی جماعت کو، قانون سازی کا حق ہوتا ہے زمامِ اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جماعت جو کچھ کرنا چاہتی ہے، پہلے اس کے لئے ایک قانون وضع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد اُس کا ہر قدم، قانون کے مطابق (LEGAL) ہو جاتا ہے اور ہر حرکت، آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پا جاتی ہے۔ اس کا نام انسانوں کی ڈکشنری میں "مہذب طرزِ حکومت" یا عادلانہ اندازِ مملکت ہے۔ لیکن، اگر الفاظ کے ان حسین و جمیل پردوں کو ہٹا کر، اصل حقیقت کو دیکھیں تو آلڈس ہکسلے کے الفاظ میں

> اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس یہ فرق نظر آئے گا کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔
>
> (ENDS AND MEANS)

قانون سازی کا حق

قرآن "قانون سازی" کا حق کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو نہیں دیتا۔ وہ قانون کے سرچشمہ اور ماخذ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ (۱۳/۳۹) وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جس قدر قوانین وضوابط کی ضرورت تھی، ان کے اصول وحدود، خدا نے متعین کر دیئے ہیں جن میں تغیر وتبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵) اب انسانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصولی قوانین کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کا فیصلہ کرتے جائیں۔ خدا نے یہ قوانین، قرآن کریم کے اندر منضبط ومحفوظ کر دیئے اور اس کے بعد، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ ان کے معاملات کے فیصلے انہی قوانین کی روشنی میں کرتے جاؤ۔ اور دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے جو خدا نے نازل کیا ہے انہیں کافر کہا جائے گا۔ (۵/۴۴)

ان اصولی قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ان اقدار کو نافذ کرنے کے لئے عملی تدابیر سوچے اور ذرائع ووسائل بہم پہنچائے۔ اس کا "حق قانون سازی" صرف اس حد تک محدود ہوگا۔ یہی وہ بنیادی اصول مملکت ہے جس کے متعلق پروفیسر جوڈ نے کہا تھا کہ

> اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔
>
> (GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

مادی اقدار

قرآن جب مملکت کو مستقل اقدار کے تحفظ کا ذریعہ بتاتا ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ محض اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کا تحفظ چاہتا ہے، اور مادی اقدار (MATERIAL VALUES) سے اُسے کچھ سروکار نہیں۔ وہ نظام مملکت کو مادی اقدار کے تحفظ کا بھی ضامن قرار دیتا ہے، اس لئے کہ انسان کی موجودہ سطح زندگی پر، اخلاقی اقدار، مادی ذرائع ہی سے بروئے کار آتی ہیں۔ اسی لئے قرآن (SOUND MIND IN A SOUND BODY) ــــ توانا جسم میں توانا قلب ــــ کے اصول کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا بہم

پہنچانا نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اِس کے لئے مملکت، خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے اور افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ إِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)۔ تمہیں اور تمہاری اولاد کو سامانِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ جب تک مملکت اس فریضہ خداوندی کو ادا کرتی رہتی ہے، وہ خدا کی حفاظت میں رہتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل ہو جاتی ہے، خدا کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

> اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی اس حالت میں صبح کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو اُس بستی کے رہنے والوں سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اور اس عظیم ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ "اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی"۔ "بنیادی ضروریاتِ زندگی" میں روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج، سب کچھ آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ، مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ اس لئے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے فرائض میں یہ بھی کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱)۔ وہ سامانِ نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ وہ لوگوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تدابیر کرتے ہیں۔ پروفیسر میکلن نے کہا تھا کہ نظری طور پر مملکت، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر، مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچائے۔

یہ مملکت، اس سامانِ پرورش اور اسبابِ نشوونما کو صرف اپنے شہریوں تک محدود نہیں رکھے گی۔ یہ

تمام انسانوں کی پرورش

اس خدا کے احکام و قوانین کو جاری و ساری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے جو ربّ العٰلمین اور ربّ النّاس ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان کا پرورش کرنے والا۔ اس لئے یہ مملکت، اس باب میں، انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرے گی۔ اس ضمن میں قوم۔ ملک رنگ۔ نسل۔ زبان، حتیٰ کہ مذہب تک کا اختلاف بھی، کوئی تفریق پیدا نہیں کرے گا۔ اس کے لئے بس "انسان" ہونا کافی ہوگا ـــــ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو۔ کسی قوم کا فرد ہو۔ کسی نسل سے متعلق ہو۔ کوئی زبان بولتا ہو۔ اور اس کا مذہب بھی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مملکت ان سب سے یکساں سلوک کرے گی۔ صرف یکساں سلوک ہی نہیں، بلکہ ان سب کی یکساں عزت کرے گی۔ اس لئے کہ وہ مستقل اقدار جن کے تحفظ کے لئے اس مملکت کی

تکریم آدمیت تشکیل ہوتی ہے، ان میں بنیادی حیثیت اس قدر کو حاصل ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) خدا نے تمام انسانوں کو، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے، یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اس عزت و تکریم کے لئے اس کا آدمی آزاد ہونا کافی ہے۔

آدمیت احترام آدمی

اس مملکت کا منشور ہوگا۔

نیشنلزم ہمارے زمانے میں، انسانی تباہی کا سب سے بڑا سبب، نیشنلزم کا مغربی تصور ہے۔ جس نے انسانوں کی برادری کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں کہ ایک انسان، دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ انسان کی، اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ وہ نقشے پر ایک لکیر کھینچ لیتا ہے اور پھر اس لکیر کے دوسری طرف بسنے والے، اپنے ہی جیسے انسانوں سے، شدید نفرت اور سخت عداوت، دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ ہمارے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ

> مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ انسانوں کی مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔
>
> (FREDRICK HERTZ — NATIONALITy IN HISTORY & POLITICS)

یہی وہ نیشنلزم ہے جو برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں

> نوع انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے اور اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔
>
> (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD)

اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ تہذیب کے آذر نے جس قدر صنم تراشے ہیں،

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبالؒ نے یہ بات، وحی کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں کہی تھی۔ یورپ کے مفکر، پچاس سال کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیشنلزم بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔
>
> (A. HUXLEY — THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

اسی لئے۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔۔۔ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔۔۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مغرب کے تصورِ قومیت کے مقابلہ میں، یہ "قومیتِ اسلام" کیا ہے جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے؟ اسے سمجھ لینے سے قرآن کی پیش کردہ مثالی مملکت کا واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳)۔ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس لئے وہی نظامِ

انسانوں کی عالمگیر برادری

تمدن صحیح اور کامیاب ہو سکتا ہے جو پوری انسانیت کو ایک قوم تصور کر کے قائم کیا جائے۔ جب تک انسان، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹا رہے گا، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یورپ نے نیشنلزم کی تباہیوں کا علاج انٹرنیشنلزم میں سوچا لیکن کتنے مختصر سے عرصہ کے تجربہ نے ہی یہ حقیقت اس پر واشگاف کر دی کہ اس مصیبت کا یہ حل بھی نہیں۔ اس لئے کہ

> جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کرسکے۔ اس مسئلہ کا حل عالمگیر انسانیت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔
>
> (EMERY REVES - THE ANATOMY OF PEACE)

انسان کے تمدنی مسائل کا یہ وہ حل ہے جسے زبانِ وحی نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیش کیا تھا۔ انسانی

ذہن نے اسے اس وقت نہ اپنایا، لیکن اب، صدیوں تک آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بالآخر وہ اس حل کی طرف آرہا ہے۔

مثالی مملکت کی تجربہ گاہ

ظاہر ہے کہ جو مثالی مملکت ان خطوط کے مطابق متشکل کی جائے گی اُس کی ابتدا کسی ایک خطۂ زمین سے ہوگی۔ یہ خطۂ زمین اس عظیم، عالمگیر انقلابی نظریہ کی تجربہ گاہ بنے گا۔ اس خطۂ زمین کی حفاظت نہایت ضروری ہوگی۔ اسلئے کہ اگر لیبارٹری ہی محفوظ نہیں رہے گی تو تجربہ کہاں ہوگا؟ اس مثالی مملکت میں وطن کی یہ حیثیت ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے اُس کا مستحکم اور محفوظ رکھنا افرادِ وطن کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔ وطن وہ صدف ہے جس میں جوہرِ انسانیت، گہرِ آبدار بنتا ہے۔ اس لئے گہر کی پرورش اور نشو ونما کے لئے صدف کی حفاظت اور استحکام ضروری ہے۔ وطن ہی نہیں، بلکہ ساری طبیعی زندگی اور مادی اسباب ووسائل وہ مَرْکب (VEHICLE) ہیں جن پر سوار ہوکر جوہرِ انسانیت اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ جو مسافر اپنی سواری کی پرواہ اور حفاظت نہیں کرتا، اس سے زیادہ احمق کون ہے۔ لیکن سواری، بہرحال ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ (MEANS) ہوتی ہے (END) نہیں ہوتی۔

مملکت انسانوں کے ہاتھوں سے عمل میں آئے گی

اب مجھے اُس سوال کی طرف آنا چاہیئے جو اس مقام پر آپ کے دل میں بار بار اُبھر رہا ہے۔ یعنی اس سوال کی طرف کہ جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے، وہ تو فی الواقعہ مثالی (IDEAL) ہیں، لیکن مملکت کا کاروبار بالآخر انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پائے گا۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ انسان ان اصولوں کو اچھی طرح چلائیں گے اور انہیں (ABUSE) نہیں کریں گے۔ جہاں تک محض اصولوں کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جس کے آئین وضوابط میں کوئی نہ کوئی اچھا اصول نہ ہو۔ ان سب کے ہاں اچھے اچھے اصول، آئینی ضابطوں میں درج ہیں لیکن انسانی ہاتھوں سے ان اصولوں کی جو دُرگت بنتی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن اس مشکل کا کیا حل تجویز کرتا ہے؟ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے، اس لئے اس کا جواب بھی، اسی نسبت سے غور طلب اور محتاجِ توجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ دنیا کی مختلف مملکتوں میں، باوجودیکہ ان کے آئین وضوابط میں بلند پایہ اصول مندرج ہیں؟ اس قدر فساد کیوں برپا ہے۔ مختلف اقوام میں، باوجودیکہ ان میں بین الاقوامی معاہدات، اور عالمی اداروں کی بلند آہنگ قراردادیں موجود ہیں، باہمی بے اعتمادی اور تخریب کوشی کیوں ہے؟ پھر کسی ایک ملک یا قوم میں نہایت عمدہ ضوابط قوانین وہدایات کے باوجود، اربابِ اقتدار ان کی پاسداری، اور عام افرادِ مملکت قانون کا

احترام کیوں نہیں کرتے؟

(SPALDING) ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (CIVILISATION IN EAST & WEST) میں لکھتا ہے۔

مادی تصوّرِ حیات موجودہ یورپ، دنیا کو "مادی انجیل" کا سبق دیتا ہے جس سے زندگی کے متعلق وہ تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ انسانی امن کے بجائے درندوں کی جنگ ہے۔ یہ عالمگیر شورش اور عدم اطمینان اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ تہذیب مغرب کے لئے (اور اس کے ساتھ دوسری تمام تہذیب کے لئے جو اس کی نقل کرتی ہیں) خطرہ کا موجب حکومت کی کوئی خاص شکل نہیں۔ اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ انکی ہر حکومت خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے۔ جب تک یہ بنیاد نہیں بدلتی، شکلوں کے بدل دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ یہ "مادی تصورِ حیات" کیا ہے جو عالمگیر فساد کی جڑ، قومی تباہ کاریوں کا موجب اور انفرادی خرابیوں کا باعث ہے۔ اس تصورِ حیات کی تفصیل تو لمبی ہے، لیکن اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی عبارت ہے اس کے جسم سے جو طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے خاتمے سے اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ انسان کی زندگی اس کے ماوراء کچھ اور ہے، اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی اور قوت ہے۔

اس تصورِ حیات کا جو اثر زندگی کے اور شعبوں پر پڑتا ہے، سردست اُسے چھوڑیئے۔ اس وقت صرف یہ دیکھیے کہ جہاں تک انسان کی تمدنی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس حقیقت کو واضح کر دیں گی۔

قانون سازی کے اختیارات (۱) خروشیف جیسا آمرِ مطلق ہو یا امریکی حکومت جیسا جمہوری ادارہ، دونوں میں قانون سازی کے اختیارات لامحدود ہوں گے۔ سیکولر گورنمنٹ کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے۔ وہ نہ کسی غیر متبدل اصول کی پابند ہو نہ کسی ناقابلِ تغیر اخلاقی شرائط سے مشروط۔ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنائے اور جب جی چاہے اس میں ترمیم کر دے یا اسے منسوخ ہی کر دے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں، ہر مملکت ایسے قوانین مرتب کرے گی جو اس مملکت کے لئے فائدہ مند ہوں۔ اسے باقی دنیا میں بسنے والے انسانوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا (ROMELIN) نے ٹھیک کہا تھا کہ

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری

ملکت کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔

ان حالات میں جو بین الاقوامی فساد برپا ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۲) حکومت میں جو پارٹی برسر اقتدار آئے گی، وہ ایسے قوانین بنائے گی جن سے اس جماعت کے مفادات کا تحفظ ہو سکے جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے۔ خواہ دوسری پارٹیوں کے مفاد پر اس کی زد کیسی ہی کیوں نہ پڑے۔ جب اس کی جگہ دوسری پارٹی برسر حکومت آئے گی تو وہ پہلی پارٹی کے وضع کردہ قوانین کو منسوخ قرار دے گی اور ایسے جدید قوانین مرتب کرے گی جن سے ان کی پارٹی کے مفاد کا تحفظ ہو۔ اس سے خود ملک کے اندر، مختلف جماعتوں اور طبقات میں جس قدر فساد برپا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قانون کی پابندی

(۳) اس تصور حیات کے ماتحت، ملک کے قانون کی پابندی صرف وہ شخص کریگا جسے اس کا احساس ہو کہ قانون کی خلاف ورزی سے

(ا) وہ سوسائٹی میں بدنام ہو جائے گا۔

(ب) پولیس کی گرفت میں آجائے گا۔ اور

(ج) عدالت اسے سزا دیدے گی۔

اگر کوئی شخص ایسا انتظام کرلے کہ وہ خلاف ورزی قانون سے پولیس کی گرفت میں نہ آسکے، اور اگر وہ پکڑا بھی جائے تو عدالت سے چھوٹ جائے۔ نیز معاشرہ میں وہ ایسا با اثر ہو کہ کوئی شخص اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکے۔ یا معاشرہ میں جرائم اس قدر عام ہو جائیں کہ جرم کا ارتکاب باعث ذلت ہی نہ سمجھا جائے، تو اس کے بعد کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں رہے گا جس کے ماتحت، قانون کی پابندی یا اس کا احترام باقی رہ سکے۔ چنانچہ آجکل تمام مہذب ممالک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ جرائم بڑھتے جاتے ہیں، اور جرائم کے انسداد کا علاج، ارباب نظم و نسق کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی کثرت اور پولیس کے اضافہ کی رفتار میں مسلسل دوڑ (RACE) جاری رہتی ہے۔ یہ تو کسی مملکت میں بھی ممکن نہیں کہ ہر شخص کے سر پر ایک سپاہی مسلط رہے۔ اس لئے جرائم کی روک تھام ناممکن ہو چکی ہے۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں کوئی مملکت بھی ایسی ہو سکتی ہے جس کا نظم و نسق صحیح خطوط پر قائم رہ سکے، اور کوئی پارٹی بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں آئے اور وہ اپنے فائدے کی نہ سوچے؟

یہ ہیں اس مادی تصور حیات کے فطری نتائج جس پر تہذیب مغرب کی اساس و بنیاد ہے۔ اس کے برعکس

قرآنی تصورِ حیات

قرآن کی رو سے تصورِ حیات یہ ہے کہ

(الف) انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما، مقصدِ حیات ہے۔

(ب) جس طرح خارجی کائنات کے لئے خدا کے متعین کردہ قوانین از خود موجود ہیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ نہیں۔ نہ ہی انسان ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ابدی اصول متعین ہیں جن میں کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔

(ج) خدا کے مقرر کردہ قوانین کی خلاف ورزی کی سزا کا انحصار اس پر نہیں کہ اگر جرم کرنے والے کو کوئی شخص دیکھ لے یا اسے گرفتار کر لے، تو اسے اس کی سزا ملے اور اگر ایسا نہ ہو، تو وہ سزا سے بچ جائے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جائے گی اور اس میں سخت تکلیف ہوگی۔ اس میں صورت یہ نہیں کہ اگر کوئی شخص آپ کو آگ میں انگلی ڈالتے ہوئے دیکھ لے تو آپ کی انگلی جلے اور اس میں تکلیف ہو۔ اور اگر اسے کوئی دیکھنے نہ پائے تو آپ اس "جرم" کی سزا سے بچ جائیں۔ یہ سزا آپ کو بہرحال مل کر رہے گی۔ خواہ آپ اس کا ارتکاب، پہاڑ کی چوٹی پر، یا زمین کے غار کے اندر، تنہائی میں بھی کیوں نہ کریں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

قانونِ مکافات

جس طرح طبیعی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کے جسم پر ہوتا ہے، اسی طرح، اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے۔ یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے انسان کی جسمانی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح حرام کا مال کھانے سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ کے غلط استعمال سے ہاتھ جل جاتا ہے، اسی طرح اختیارات کے غلط استعمال سے انسانی ذات کی صلاحیتیں جھلس جاتی ہیں۔ اسے جہنم کا عذاب کہا جاتا ہے۔ جس طرح سنکھیا اپنا ہلاکت آفریں اثر کر کے رہتا ہے خواہ آپ اسے بند کمرے کے اندر، ایسے وقت میں کھائیں جبکہ آپ کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو، اسی طرح مالِ حرام اپنا تباہ کن اثر کر کے رہتا ہے خواہ اس کا کسی کو علم ہو سکے یا نہ۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ○ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۳/۱۰-۱۱)

اس کے لئے برابر ہے خواہ تم میں سے کوئی بات کو چھپائے یا اسے بلند آواز سے کہے۔ خواہ وہ رات کی تاریکیوں میں

کچھ کرے یا دن کی روشنی میں چلے۔ اس کے آگے اور پیچھے ایسے پاسبان لگے ہوتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر نقل و حرکت اور قول و عمل کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ریکارڈ کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ یہ ریکارڈ ہر انسان کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (۱۷/۱۳)۔

نگاہ کی خیانت جہاں تک طبیعی قوانین کا تعلق ہے، ان کا نقصان صرف اس وقت پہنچتا ہے جب ان کی خلاف ورزی عمل میں آجائے۔ آپ ہزار مرتبہ دل میں خیال کریں کہ جب آپ کے سامنے آگ آئے گی تو آپ اس میں کود جائیں گے۔ اس سے آپ کے جسم پر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ کا جسم اُس وقت جلے گا جب آپ عملاً آگ میں کود جائیں گے۔ لیکن جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے، ان کی خلاف ورزی کا نقصان، ارادہ کرنے سے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ وہ ذرا اندر جائے اور آپ اس کا قلم اڑا لیں۔ آپ دیر تک اسی خیال میں بیٹھے رہتے ہیں لیکن (آپ کی بدقسمتی کہ) وہ اٹھ کر اندر نہیں جاتا۔ آپ بالآخر تھک کر ناکام چلے آتے ہیں۔ آپ نے چوری نہیں کی۔ دنیا کا کوئی قانون آپ سے مواخذہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اخلاقی اقدار کے قانون کی رُو سے، آپ کی ذات کو اس ارادہ سے بھی سزا مل جائے گی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹)۔ وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔

اپنے خلاف آپ شہادت دنیاوی جرائم کی عدالت میں اگر مجرم کے خلاف شہادت یا ثبوت نہ ملے تو وہ چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اخلاقی اقدار کی عدالت میں، نہ کسی خارجی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے نہ باہر کے گواہ کی۔ وہاں ہر مجرم، اپنے خلاف خود گواہی دیتا اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷/۱۴)۔ آج خود تیری اپنی ذات تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ پھر جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے کے بعد، گورنر جنرل کی سفارش بھی آپ کو اس کے درد سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اور لاکھ روپے کی رشوت بھی آپ کو اس تکلیف سے بچا نہیں سکتی۔ نہ ہی کوئی دوسرا آپ کی جگہ وہ دُکھ بھگت سکتا ہے۔ اسی طرح مسلّمہ اقدار کی خلاف ورزی کی سزا سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۴۸)۔

اس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام آسکے گا۔ نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کچھ معاوضہ لیکر

سے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی اس کا کوئی حامی و ناصر ہوگا۔

ان لوگوں کے ہاتھ میں نظم و نسق

قرآن کی مثالی مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جن کا خدا کے اس قانونِ مکافات پر پورا پورا یقین ہو، اس پر ان کا ایمان ہو۔ جنہیں یقین محکم ہو کہ اقدارِ انسانیت کی خلاف ورزی سے ان کی ذات کا نقصان ہوگا اور یہ نقصان دنیاوی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح عام مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہ ہو، اسی طرح اس مثالی مملکت کا انتظام بھی ان لوگوں کو نہیں سونپا جاتا جنہیں اپنی ذات کے نفع نقصان کا خیال نہ ہو۔ ایسے لوگ اس کے اہل ہی تصور نہیں کئے جاتے۔ وہ اس کے لئے (DISQUALIFY) ہو جاتے ہیں۔

ایمان کسے کہتے ہیں

کہہ دیا جائے گا کہ کرنے کو تو اس قسم کا اقرار ہر شخص کر لیتا ہے لیکن ان باتوں کو عمل میں کوئی نہیں لاتا۔ اس لئے بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ اپنے ایمان کے مطابق عمل بھی کریں گے۔ اس کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ آپ آگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ اس لئے کہ آپ کو یقین ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے آپ کا ہاتھ جل جائے گا۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان طبیعی قوانین کے متعلق ہے۔ مستقل اقدار کے متعلق بھی جس کا ایمان اس قسم کا ہو، اسے ایمان والا کہا جائے گا۔ اس قسم کے ایمان کے بعد ممکن نہیں کہ انسان زبان سے کچھ کہے اور عمل اس کے خلاف کرے جو شخص جانتا ہے کہ سنکھیا ہلاک ہوتا ہے اس کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ زبان سے تو سنکھیا کو ہلاک کہے لیکن جب سنکھیا سامنے آئے تو اسے جھٹ سے نگل لے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بڑی سے بڑی رشوت بھی اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ مال و دولت کا عظیم نقصان بھی اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکے گا۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گا لیکن سنکھیا نہیں کھائے گا۔ اسے کہتے ہیں سنکھیا کی ہلاکت آفرینی پر ایمان۔ اس سے کم درجے کا اقرار ایمان کہلاتا ہی نہیں۔ لہٰذا کسی مومن کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایسے کام کے لئے آمادہ ہو جائے جس سے اس کی ذات کی ہلاکت ہوتی ہو۔

ایسے لوگ ہوں گے اس مثالی مملکت کے ارباب حل و عقد۔

دین کی بنیادوں پر مملکت

یہ بنیادیں جن پر اس مثالی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں، دین کے اجزا کہلاتے ہیں۔ جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت ہوتی ہے۔ اور جب دین سے الگ ہو جائے تو تباہیوں کا موجب۔

طرز حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے، مستقل اقدار کی بنیادوں پر۔ اور اس کی بقا کا راز اس غیر متبدل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

بقا اسی کے لئے ہے جو تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

انسانیت کے لئے نفع بخش کسی خاص جماعت۔ خاص پارٹی۔ خاص گروہ۔ خاص ملک۔ خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش۔ — حتیٰ کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ اس میں غیر مسلم کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل و انصاف کی رو سے طے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل ان کا فریضہ ہوتا ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵/۸)۔

کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔

پروفیسر (J. D. MABBOTT) نے کہا تھا کہ

اچھی حکومت اسے کہنا چاہیئے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو۔ کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ باہمی معاملات میں خوشگواری ہو۔ اور افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رو سے کئے جا سکیں۔

(THE STATE AND THE CITIZENS)

قرآنی تصور کے مطابق قائم شدہ مملکت ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ یہی وہ مملکت ہوتی ہے

جس کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ذہن انسانی کے تجویز کردہ نظام حکومت اور وحی کے خطوط پر تشکیل مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے ——— وہی فرق جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ مملکت

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بدتر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

صحیح اسلام

سمجھنے کیلئے پرویز صاحب کا لٹریچر دیکھئے
اس کی تفصیل کیلئے
آپ ایک کارڈ
ذیل کے پتہ پر بھیج دیجئے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷- بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۵)

اسلام کیا ہے؟

محترم پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوع اسلام کنونشن (سنہ ۱۹۶۳ء) کے
آخری کھلے اجلاس سے خطاب کیا

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کیا ہے؟

اسلام نام ہے قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا۔ ان کی اطاعت کرنے کا۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس، ان قوانین سے انکار، انحراف اور سرکشی کا نام کفر ہے۔

کائنات کی سجدہ ریزی

۲۔ آپ اس عظیم القدر محیّر العقول کارگہِ کائنات پر نگاہ ڈالیے۔ اس میں ہر شے لگے بندھے قانون کے مطابق مصروفِ عمل ہے۔ کسی کو ان قوانین سے یارائے انحراف نہیں۔ مجالِ سرکشی نہیں۔ کوئی اس راستے سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا جو اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْأَرْضِ
وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُومُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ
......[1] (۲۲/۱۸)

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار ...... سب قوانین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

یہ سب اُس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہیں اور ان میں سے کسی کو ان سے مجالِ سرکشی نہیں۔

---

[1] اس مقام پر آیت کا باقی حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۹)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں۔ ارض و سمٰوٰت میں۔ جو کچھ ہے، خواہ وہ حیوانداز مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں سب قوانین خداوندی کے سامنے سربسجود ہیں اور اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

ان کا منصب زندگی اور نہج حیات یہ ہے کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۱۶/۵۰) جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کے مطابق کام کئے چلے جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے اوپر کہا ہے کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، سب قوانین خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے؟ اس حقیقت پر غور کرنا تو بہت بڑی بات ہے کہ وہ کونسے قوانین ہیں جن کے مطابق کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے سرگرم عمل ہے اور وہ چیزیں ان قوانین کی اطاعت کس طرح کرتی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جنہیں قرآن کریم "سمٰوٰت" (بلندیاں) کہہ کر پکارتا ہے، وہ کس قدر تحیر انگیز مظاہر فطرت کا گہوارہ ہیں۔

سمٰوٰت کی تحیر انگیزی

اس زمانہ میں وسائل رسل و رسائل کی کثرت اور ذرائع آمد و رفت کی فراوانی سے، اس حقیقت کو تو ہم سمجھ گئے ہیں کہ ہماری زمین ایک عظیم الجثہ کرہ ہے جو ہر وقت گردش میں مصروف ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت کم ہوں گے جنہیں اس کا علم ہوگا کہ کائنات کی ان حدود فراموش بلندیوں میں جس قدر اجرام فلکی تیر رہے ہیں، ان میں ہماری زمین کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرے کی۔ یہ مثال شاعری نہیں، حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ سورج — جو ہمیں ایک طشت سے زیادہ بڑا نظر نہیں آتا۔ اور جو ہم سے زیادہ دور بھی نہیں۔ صرف نوکروڑ انتیس لاکھ (۹،۲۹،۰۰،۰۰۰) میل دور ہے۔ اس کا قطر ہمارے زمین سے ۱۰۹ گنا بڑا ہے۔ یعنی آٹھ لاکھ۔ چوالیس ہزار (۸،۶۴،۰۰۰) میل۔ اس کی جسامت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس میں ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم کرہ، بایں ہمہ ضخامت و جسامت، دیگر اجرام سماوی کے مقابلہ میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے جتنی سمندر میں ایک قطرہ۔

یہ ستارے جو شب کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے چراغ دکھائی دیتے ہیں، ان میں سے جو ستارہ ہم سے قریب تر ہے، وہ ہم سے کتنی دور ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جتنی دور ہم سے سورج ہے، اس سے

دو لاکھ ستر ہزار سے ضرب دیجئے تو اس کا ہم سے اتنے میلوں کا فاصلہ ہے۔ ہمارا قریب ترین ستارہ ہم سے اتنی دور ہے۔

اجرام فلکی کے فاصلے، ہماری سڑکوں کے میلوں سے نہیں ماپے جاتے۔ انہیں "روشنی کے سالوں" سے ماپتے ہیں۔ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک سال میں کس قدر مسافت طے کرتی ہوگی۔ ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک ۱،۸۵،۰۰۰ سال میں پہنچتی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے اس ستارے سے ہم تک ایک لاکھ پچاسی ہزار سال کے عرصے میں پہنچتی ہے۔ یہ تو خیر دور کے ستاروں کی بات ہے۔ یہ کہکشاں، جسے ہمارے شاعر گرد مرمریں کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں، لاتعداد "ستاروں کی دنیا" کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے قریب ترین ستارے کی روشنی ہم تک اٹھارہ ہزار چار سو روشنی کے سال میں پہنچتی ہے۔ آسمان میں ستارے کتنے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگر ہم ڈیڑھ ہزار ستارہ فی منٹ کے حساب سے گننے لگیں تو سات سو سال میں ان کی گنتی پوری ہو۔

اور "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ اس دنیا کو ہیولی کائنات (NEBULA) کہا جاتا ہے۔ ہماری دوربین جس بعید ترین ہیولی کو اس وقت تک پا سکی ہے وہ ہم سے پچیس کروڑ روشنی کے سال (LIGHT YEARS) کے فاصلے پر ہے۔ یعنی وہاں سے روشنی، ایک سیکنڈ میں، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے، ہم تک پچیس کروڑ سال میں پہنچ سکتی ہے۔

آپ نے سمٰوٰت کی وسعتوں اور بلندیوں کا اندازہ فرمایا؟ یہ ہیں وہ سمٰوٰت جن میں ہر شے، قوانین خداوندی کے مطابق سرگرم عمل ہے اور کسی کو اس کی مجال نہیں کہ اپنے مقررہ راستے سے انچ کا ہزارواں حصہ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے یا اس کی رفتار میں سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا بھی فرق پڑ جائے۔

یہ تمام اجرام فلکی، کائنات کی فضا میں معلق ہیں ۔۔۔ یعنی ایسے ستونوں سے جکڑے ہوئے جنہیں قرآن کریم "غیر مرئی" کہہ کر سمجھاتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (۱۳/۲) اللہ وہ ہے جس نے ان تمام عظیم القدر اجرام سماوی کو بلندیوں میں تھام رکھا ہے، بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو۔ یہ غیر مرئی ستون، وہ کشش ثقل (GRAVITATIONAL PULL) ہے جو ایک دوسرے کرے کو تھامے ہوئے ہے۔

کشش ثقل

آپ نے فضائے آسمانی کی وسعتوں اور اجرام سماوی کی تعداد کے متعلق کچھ سن لیا ہے اور یہ بھی

دیکھ لیا ہے کہ ان مختلف اجرام میں فاصلہ کس قدر ہے۔ اور پھر یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ان تمام اجرام فلکی کو ایک دوسرے کی کشش تھامے ہوئے ہے۔ اس کشش ثقل سے متعلق قانون کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سر جیمز جینز کے الفاظ میں، اگر ہم اپنی ایک انگلی بھی ہلائیں تو اس کا اثر اجرام فلکی میں سے ہر ایک پر پڑتا ہے۔ اجرام فلکی کے وزن جسامت فاصلہ وغیرہ کے متعلق جس قدر معلومات حاصل کی جاتی ہیں، ان کی بیشتر بنیاد کشش ثقل کا محیر العقول قانون ہے۔ اور یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اگر کسی ستارے یا کرے کی کشش کے تناسب میں غیر محسوس سا فرق بھی آجائے تو کائنات کا سارا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ تو اس بے پایاں فضا میں تیرنے والے عظیم الجثہ اجرام فلکی کی محیر العقول عظمتوں اور وسعتوں کا ہلکا سا تصور ہے۔ دوسری طرف ذرات کی طرف آیئے تو ایک قطرہ پانی میں کروروں سالمات (MOLECULES) ہوتے ہیں۔ اور ہر سالمہ میں ایک ایٹم آکسیجن کا اور دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا قطر ایک سنٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ اس ذرۂ ناچیز پر نگاہ رکھئے اور پھر اس کی اس عظمت پر کہ نظام شمسی کی طرح اس کا اپنا نظام ہے جس میں ایک مرکزی ہیولی ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک برقیہ (ELECTRON) گردش کرتا ہے۔ یہ برقیہ، سالمہ کے لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی رفتار کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ اپنے محور کے گرد ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصہ میں، سات ارب دفعہ گردش کرتا ہے۔ اور یہ گردش ایک غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یہ ہے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی نہایت خفیف سی جھلک۔

قرآن کریم نے اس تحیر انگیز نظام کائنات کو ایک لفظ میں بیان کر دیا ہے۔ اور وہ لفظ ہے ـــــ اسلام ـــــ اور اسی کو اس نے دین اللہ کہا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

یہ کائناتی اسلام ہے

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ (۳/۸۳)

کیا یہ لوگ دین اللہ۔ نظام خداوندی۔ کے خلاف کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ارض و سموٰت میں جو کچھ ہے، سب طوعاً و کرہاً اس نظام کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہے۔ اور ہر ایک کی گردش اسی محور کے گرد ہے۔

یعنی وہ نظام زندگی جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے، دین اللہ کہلاتا ہے اور کائنات کی ہر شے اسی دین کو اختیار

کئے ہے۔ اس نظام زندگی کو اختیار کرنے کا نام الاسلام ہے۔ یہی اندازِ زندگی صحیح منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۸۵)۔ جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ زندگی چاہتا ہے، تو وہ نظام کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے کا دین (نظامِ زندگی) اسلام ہے۔ ہر شے قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔ یہ اطاعت، ایک مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ہے جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے۔ ہر شے کی تگ و تاز اور جد و جہد، خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ (۲/۱۱۶) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے تجویز فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہے اور ہر ایک نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لئے محفوظ اور وقف کر رکھا ہے۔ "قَانِتُوْنَ" کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ سِقَاءٌ قَنِيْتٌ اُس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہونے دے اور اسے بر محل صرف کرنے کے لئے روک کر رکھے۔ اشیائے کائنات میں لامحدود قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ ایک سورج کی توانائی ہی کو دیکھئے۔ وہ حرارت اور روشنی کا کیسا عظیم (RESERVOIR)، ہے۔ لیکن کیا مجال جو اپنی توانائی کی ایک رمق بھی، اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد میں صرف کر جائے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے ذمے ایک فریضہ عائد کر دیا گیا ہے اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں رات دن سرگرداں ہے۔ اسے عربی زبان میں "تَسْبِيْحٌ" کہتے ہیں۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۵۷/۱)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب، نظامِ خداوندی کی تکمیل میں پوری شدت اور تیزی سے سرگرمِ عمل ہے۔ اُس خدا کے نظام کی تکمیل میں جو بڑی قوتوں اور عمدہ تدبیروں کا مالک ہے۔ نظامِ خداوندی کا یہی وہ تاگہ ہے جس میں اس نے اشیائے کائنات کے "تسبیح کے دانوں" کو اس حسن و خوبی سے پرو رکھا ہے کہ کوئی ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا۔ ان عظیم عناصر کو اس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے سکے۔

تسخیرِ کائنات

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳)۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کے لئے قانون کی زنجیروں

مسخر کر رکھا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ۔ اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے پھل پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے لئے سامانِ زیست ہیں وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ اس نے تمہارے لئے جہازوں کو قانون کی زنجیروں میں مسخر کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق تیرتے پھرتے ہیں وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ کشتیاں، سمندر اور نہریں ہی نہیں۔ اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند تک کو قانون کے حلقوں میں باندھ رکھا ہے اور وہ مسلسل و متواتر چل رہے ہیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ (۱۴/۳۲-۳۳)۔ اور اسی طرح اس نے دن اور رات کو تمہارے فائدے کے لئے ایک نظام کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

کائنات کی طرف وحی

وہ قوانین جن کے مطابق اشیائے کائنات نے اپنے اپنے فرائض کو سرانجام دینا ہے، ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں؛ انہی کو قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وحی خداوندی ہے جو ان میں سے ہر ایک کی طرف براہ راست ہوتی ہے۔ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲)۔ اور اس نے ہر سماء (بلندی) میں اس کے قانون کو وحی کر دیا۔ اور اسی طرح ارض میں بھی۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (۹۹/۵)۔ یہی وہ وحی ہے جس کی رو سے کائنات کی ہر شے، اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ (۲۴/۴۱)۔ ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض زندگی کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کے لئے اس کے دوائر تگ و تاز کونسے ہیں۔ اسی کو خدا نے اپنی طرف سے عطا کردہ ہدایت یا راہ نمائی سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرعون نے حضرت موسٰے سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰/۵۰)۔ ہمارا نشو و نما دینے والا وہ ہے جس نے ہر شے کو تخلیقی پیکر عطا کیا۔ اسے پیدا کیا۔ اور پھر اسے وہ راہ نمائی عطا کر دی جس کے مطابق اس نے سفرِ زندگی طے کرنا ہے۔ اشیائے کائنات میں خدا کی یہ راہ نمائی کس محیر العقول انداز سے کارفرما ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے

اس راہ نمائی کی مثالیں

ان چیزوں کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں ان کے مشاہدات کے نتائج ایسے تحیر انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ (مثلاً) یورپ اور شمالی افریقہ کی جھیلوں اور ندیوں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے ایل (EEL)[1] کہتے ہیں۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد یہ مچھلیاں اپنے اپنے مساکن سے باہر نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں دلدل اور گھاس میں سے گذرتی ہوئی ایک سے دوسری جھیل اور ندی تک پہنچتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے، بحر اطلانطک میں، جزیرہ برموڈا کے قریب پہنچ جاتی ہیں جہاں سمندر بہت گہرا ہے۔ دوسری طرف، امریکہ کی ایل مچھلیاں بھی اسی طرح وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں، گہرے سمندر میں انڈے دیکر، مر جاتی ہیں۔ ان کے بچے، انڈوں سے نکلنے کے بعد اپنے اپنے آبائی وطن کی طرف چل نکلتے ہیں اور انہی راستوں سے ہوتے ہوئے، جن سے ان کے ماں باپ گزرے تھے، اپنی اپنی جھیلوں اور ندی نالوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی راستہ بھولتا ہے اور نہ ہی کسی غلط جگہ پہنچتا ہے۔ اس سفر میں انہیں تین سال تک کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ مشاہدہ کرنے والے ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن یہ راز کسی پر نہیں کھلتا کہ وہ کونسی قوت ہے جو ان انڈوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو، جن کے ماں باپ ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے، ان کے آبائی وطن کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ اور وہ ہزاروں میل کی مسافت میں کہیں راستہ نہیں بھولتے۔

یہی کیفیت سامن مچھلی کی ہے۔ ہر نوزائیدہ سامن، کچھ وقت کے لئے سمندر میں جا کر رہتی ہے۔ پھر واپسی پر سمندر سے اس دریا میں پہنچتی ہے جس سے وہ سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دریا سے، اس معاون ندی کا رُخ کر لیتی ہے جو اسے اس دریا میں لائی تھی۔ اور اس ندی سے پھر اپنی مرز بوم تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر آپ اسے راستے میں پکڑ کر کسی غلط ندی میں چھوڑ دیں، تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے فوراً پیچھے کی طرف لوٹ کر، بڑے دریا میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے اپنی صحیح ندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

یہی کیفیت مہاجر پرندوں (MIGRATORY BIRDS) کی ہے۔ بحر الکاہل میں بہت سے جزیرے ہیں جہاں خاص قسم کے پرندوں کے سوا کوئی جاندار نہیں ملتا۔ یہ پرندے۔ سردی کے موسم میں جزائر ہوائی (HAWAII) میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دو ہزار تین سو میل کا سفر، سمندر کے اوپر

---

[1] اس کو توبہ کہتے ہیں۔

ایک ہی اڑان میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ وہاں انڈے دیکر واپس آجاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کے بچے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنے ماں باپ کے نقش قدم پر (جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اور جنہیں انہوں نے دیکھا تک نہ تھا) سیدھے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں، سمندر کے اوپر، وہ کونسے نشانات راہ ہیں جو انکی راہ نمائی، ان کے مستقر کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں؟ یہ راہ نمائی وہی ہے جو خدا کی "وحی" نے ان کے اندر رکھ دی ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ اسی سلسلہ میں ایک مبصر مسٹر (C.T. HUDSON) نے اپنی کتاب (BIRDS AND MAN) میں اس قسم کے مہاجر پرندوں کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان مہاجرین کا قافلہ اڑ گیا تو پیچھے دو پرندے رہ گئے۔ ان میں سے ایک زمین پر چلتا تھا اور دوسرا اس سے ذرا آگے فضا میں اڑتا تھا۔ اڑنے والا پرندہ، تھوڑی دور جاکر پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ چلنے والے پرندے کو آواز دیتا۔ لیکن جب وہ اپنی رفتار میں تیزی نہ کرتا، تو وہ بھی نیچے اتر آتا تاکہ وہ اس کے ساتھ آملتا۔ وہ پھر اڑتا۔ دونوں اس طرح، افتاں و خیزاں، اپنے قافلے کے رخ پر چلتے جاتے۔ اس نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نر اور دوسری مادہ ہے۔ مادہ کا ایک بازو ٹوٹا ہوا ہے اور وہ اڑنے کے قابل نہیں۔ نر اسے تنہا چھوڑ کر اکیلا نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے کہ وہ اس کی رفیقۂ حیات ہے۔ انسان کا بچہ ہوتا تو اپنی پرشکستہ بیوی کو لات مار کر الگ کر دیتا اور خود دوسری لے آتا!

بہرحال یہ ضمنی بات تھی۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ کائنات میں ہر شے کو خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے اور وہ، بلا چون وچرا، اس راہ نمائی کا اتباع کرتی چلی جاتی ہے۔ ان میں سے کسی کو اس راہ نمائی سے مجال انکار یا یارائے سرکشی نہیں۔ اسی سے یہ عظیم القدر سلسلۂ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے کہ اس میں کہیں کوئی سلوٹ، کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتی۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں، کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔ ذرا نگاہ کو پلٹ کر دیکھو تو سہی۔ کیا کہیں کوئی نقص، کوئی شگاف، کوئی عیب نظر آتا ہے؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ۔ ایک بار نہیں، عقاب نگاہ کو بار بار، کائنات کی پہنائیوں میں چھوڑ دو۔ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ (۶۷/۴)۔ اسے کہیں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا اور وہ خاسر و نامراد، ہار تھک کر کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔

کوئی سلوٹ یا جھول نہیں

یہ اس لئے کہ ساری کائنات، دین خداوندی ـــــ الاسلام ـــــ کے مطابق چل رہی ہے۔

اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس میں کوئی خلل، کوئی فساد۔ کوئی فتنہ، کوئی فطور ہو۔ فتنہ وفساد تو غیر اسلامی زندگی میں ہوتا ہے۔ اسلامی نہج زندگی میں فتنہ وفساد کا کیا کام؟

جب عالم موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانونِ زندگی اور ضابطۂ حیات متعین ہے، تو کیا انسان

انسانی دنیا

جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی، اور نظم کائنات کا حسین مقطع ہے، اس ضبط و آئین سے مستثنیٰ ہوگا؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ نظام کائنات کے خلاف ہوگا۔ جب کائنات کی ہر شے ایک نہج واسلوب کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص ضابطہ حیات کے مطابق دنیا میں رہے۔ یہ طریق حیات اور نہج زندگی وہی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی الاسلام کہہ کر پکارا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۳/۸۳)۔ انسانوں کے متعلق بھی کہا گیا کہ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ...... (۲/۱۱۲)۔ اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ كُلٌّ لَهُ قَانِتُوْنَ (۲/۱۱۶)۔ انسانوں سے کہا گیا کہ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (۲/۲۳۸)۔

انسان کی زندگی کے دو حصے یا دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح وہ ہے جسے طبیعی زندگی PHYSICAL LIFE کہا جاتا ہے۔ یہ اس کے جسم کی زندگی ہے اور اس پر وہی قوانین نافذ ہیں جن کے ماتحت حیوان زندگی بسر

جسمانی زندگی

کرتے ہیں — کھانا، پینا، سونا، افزائش نسل وغیرہ — پانی جس طرح ایک بیل کی پیاس بجھاتا ہے، اسی طرح انسان کے لئے وجہِ تسکین ہوتا ہے۔ اچھی غذا جس طرح ایک گھوڑے کی پرورش کرتی ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی فربہی اور تقویت کا موجب بنتی ہے۔ سنکھیا جس طرح ایک کتے کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح انسان کو بھی مار دیتا ہے۔ یہ بھی قوانین خداوندی ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کو طبیعی زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی اس کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے۔ لیکن انسانی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے جو اسے حیوانات سے یکسر الگ اور ممتاز

انسانی زندگی

کر دیتی ہے۔ اگر پہلی سطح کی زندگی کو اس کی حیوانی زندگی (ANIMAL LIFE) کہا جائے تو اس دوسری سطح زندگی کو اس کی "انسانی زندگی" (HUMAN LIFE) سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس کی حیوانی سطح کا مدار اس کے طبیعی جسم پر ہے۔ لیکن اس کی انسانی زندگی کا قیام اس کی ذات سے وابستہ ہے جسے (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح جسم

جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول وضوابط متعین ہیں۔ اگر ان اصول وضوابط کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہو جائے تو جسم کی موت کے بعد بھی انسان، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ اصول وقوانین جن کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ یہ انسان کو، خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں، لیکن اس وحی اور اُس وحی کے طریق میں بنیادی فرق ہے جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت، اس کا صاحب اختیار وارادہ ہونا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے انسان، حیوانات سے متمیز ہوتا ہے اور جو اس کے لئے باعث صد شرف وافتخار ہے۔ اسی اختیار وارادہ کا نتیجہ ہے کہ انسان کی طرف وحی بھیجنے کا طریق الگ تجویز کیا گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بے جان اشیائے کائنات میں سے ہر شے کے اندر، اور جانداروں کی ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائشی طور پر وہ راہ نمائی رکھ دی گئی ہے جس کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ چیز ان کی جبلت میں داخل ہے۔ اور جبلت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پیروی مجبوراً کی جائے اس سے گریز اور مفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ (انسان کے علاوہ) کائنات کی ہر شے ان قوانین کی اطاعت از خود کئے جا رہی ہے جو اس کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ اگر انسانی ذات سے متعلق اصول وقوانین بھی، ہر انسانی بچے کے اندر، پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کر دیئے جاتے، تو انسان بھی ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہو جاتا۔ اور یہ چیز اس کے صاحب اختیار وارادہ ہونے کے یکسر منافی ہوتی۔ اس کے لئے مشیت نے یہ پروگرام مقرر کیا کہ یہ قوانین انسانوں میں سے ایک منتخب ہستی کو بذریعہ وحی دیدیئے جاتے، اور اس سے کہہ دیا جاتا کہ وہ انہیں دوسرے انسانوں کے سامنے رکھ دے۔

سلسلۂ نبوت اور ان انسانوں سے کہہ دیا جاتا کہ اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو انہیں اختیار کر لیں اور چاہے ان سے انکار کر کے، اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کر لیں۔ لیکن اتنا سمجھ لیں کہ ان قوانین کے اتباع سے انہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے وہ تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔ مشیت کی اس اسکیم کا نتیجہ ہے کہ جہاں، کائنات کی تمام اشیاء، قوانین خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کئے ہیں، انسانوں میں سے بعض ان قوانین کو مانتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب، قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں — سورج۔ چاند۔ ستارے

پہاڑ۔ درخت۔ اور جاندار۔ لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، ان میں سے بعض ان قوانین کے سامنے جھکتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۗ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ..... (۲۲/۱۸)۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) اشیائے کائنات کے متعلق کہا ہے کہ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا (۳/۸۳)۔ یہ سب طوعاً و کرہاً قوانین خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۱۱۲)۔ ہاں! جو کوئی ان میں سے اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دے اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے۔ تو اس کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق ملے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ دوسرے مقام پر اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ (۳۰/۲۶)۔ سب اس کے قوانین کی اطاعت کرتی ہیں۔ لیکن انسانوں سے کہا گیا کہ قُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (۲/۲۳۸)۔ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اسی کو حسین ترین نظامِ زندگی کہا گیا۔ یعنی انسانوں کا بر ضا و رغبت بطیب خاطر اپنے اختیار و ارادہ کو کام میں لا کر علیٰ وجہ البصیرت، قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا۔ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ..... (۴/۱۲۵)۔ انسان کو یہ اختیار طبیعی دنیا میں بھی حاصل ہے اور انسانی دنیا میں بھی۔ مثلاً پانی کے لئے قانون یہ مقرر ہے کہ اگر اس پر کوئی خارجی دباؤ نہ ہو تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ زمینیں ندی کے نشیب کی طرف بھی ہوتی ہیں فراز کی طرف بھی۔ جو کسان اپنا کھیت نشیب کی طرف بناتا ہے وہ قانون خداوندی کی اطاعت کرتا ہے ـــ یا یوں کہئے کہ وہ اپنی کوششوں کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے ـــ اور اس کا پھل پاتا ہے۔

اختیار و ارادہ

طبیعی زندگی کے مفاد

یہ قوانین چونکہ انسان کی حیوانی سطح زندگی سے متعلق ہیں، اس لئے یہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ لوگ نہ انسانی ذات کو تسلیم کریں۔ نہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھیں۔ نہ مستقل اقدار کو مانیں، اور زندگی صرف اس دنیا کی طبیعی زندگی کو سمجھیں، وہ بھی اگر ان قوانین کی اطاعت کریں، تو انہیں ان کے نتائج اسی طرح ملیں گے جس طرح ان لوگوں کو جو مذکورہ بالا تمام امور پر یقین رکھیں۔ قرآن کریم نے اوّل الذکر طبقہ کو صرف "حیات الدنیا" کے ماننے والے اور دوسرے طبقہ کو "دنیا اور آخرت" دونوں کے ماننے والے قرار دیا ہے۔ پہلے طبقہ کی ساری کوششیں دنیاوی مفاد کے

حصول میں صرف ہو جاتی ہیں اور ان میں انسانی اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ○ (۲/۲۰۰) ۔ لوگوں میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ دنیاوی زندگی میں مل جائے۔ ان کا اُخروی مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ...... (۲/۲۰۱) ۔ اور وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوں اور حیات اُخروی کی خوشگواریاں بھی۔ یہ لوگ قرآن کریم کی اصطلاح میں "مومن" کہلاتے ہیں — یعنی وہ لوگ جو خدا کے مقرر فرمودہ قوانین طبیعی کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور مستقل اقدار کی نگہداشت بھی۔ ان کے برعکس، جو لوگ صرف قوانین طبیعی کو تسلیم کرتے ہیں اور وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار کو نہیں مانتے، انہیں کافر — یعنی نہ ماننے والے — کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانین طبیعی کا ماننا اور ان کے مطابق کوشش کرنا، مومن اور کافر دونوں کے لئے ضروری ہے۔ جو بھی ان کے مطابق کوشش کرے گا۔ وہ ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہوگا۔

مومن و کافر

قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے، جہاں فرمایا کہ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ○ جو کوئی اس طبیعی زندگی کے مفادِ عاجلہ چاہتا ہے، ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، یہ مفاد دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مستقبل تباہ و برباد ہوتا ہے۔ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ○ اور جو (دنیاوی مفاد کے ساتھ) مستقبل کے مفاد بھی چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے پوری پوری کوشش کرتا ہے اور (خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے، تو ان لوگوں کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔ كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ○ (۱۷/۱۸-۲۰) ۔ ہم دونوں گروہوں کو، ان کی کوششوں کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری عطا کردہ نعمتوں کا دروازہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ ہم نے ان کے سامنے کوئی بند نہیں لگا دیا کہ فلاں لوگ اس کے اندر آسکیں گے اور فلاں نہیں۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○ (۴۵/۱۳) ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب کچھ

خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ تو اس میں خطاب کسی خاص گروہ سے نہیں۔ خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے کر، فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لائے گی، وہ ان سے متمتع ہو جائے گی۔ مومن اور کافر فرق اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ کافر فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اپنے فیصلوں کے مطابق صرف کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنم ہے جس میں اس وقت دنیا مبتلا ہے۔ جس قدر فطرت کی قوتوں کی تسخیر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر اس جہنم کی آگ میں وسعت اور شدت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن مومن، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں خدا کی متعین فرمودہ مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے جس سے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدود اللہ کے اندر رہنا کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنی صلاحیتوں اور فطرت کی قوتوں کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے صرف کرنا، جنہیں خدا نے تمام نوع انسان کے عالمگیر مفاد کلی کو سامنے رکھ کر متعین کیا ہے۔ مثلاً جب "قوم کافر" فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے تو وہ انہیں اپنے مفاد اور دوسری اقوام کی تخریب کے لئے صرف کرتی ہے۔

مومن اور کافر فرق

ظاہر ہے کہ جب مختلف اقوامِ عالم ان قوتوں کو، اپنے اپنے مفاد اور دوسروں کی تخریب کے لئے استعمال کریں گی تو اس سے دنیائے انسانیت میں عالمگیر فساد برپا ہو جائے گا۔ لیکن جب "قوم مومن" ان قوتوں کو مسخر کرے گی تو وہ انہیں تمام نوع انسان کی پرورش اور نشو و نما کے لئے صرف کرے گی۔ کیونکہ ربوبیت عالمینی ایک مستقل قدر ہے جسے یہ ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکتی۔ یا مثلاً جب حکومت "قوم کافر" کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرے گی۔ اسے مختلف طبقات میں تقسیم کر دے گی جس سے غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ عدل و انصاف مٹ جائے گا اور تمام فیصلے حکمران طبقہ کے مفاد کے ماتحت ہوں گے۔ لیکن جب یہی حکومت، قوم مومن کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرے گی۔ تمام افراد معاشرہ کے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشو و نما ضرورت کے مطابق مہیا ہوں گے۔ ہر انسان کی، بہ حیثیت انسان عزت و تکریم ہوگی۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوگی نہ کسی کے خلاف زیادتی۔ اس لئے کہ ان تمام امور کے لئے، خدا کی طرف سے دیئے ہوئے اصول و قوانین پر ان کا ایمان ہوگا اور انہی کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کا نصب العین حیات۔ اس سے جہاں اس دنیا میں جنتی معاشرہ قائم ہو جائے گا، اس کے ساتھ ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ایسے انداز سے ہوتی جائے گی جس سے وہ، مرنے کے بعد کی زندگی میں ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یعنی یہاں بھی جنت وہاں بھی جنت۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کا راز، نوع انسان کی عالمگیر ربوبیت

اور نظامِ عدل و احسان میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کیا ہے؟ تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اسلام نام ہے طبیعی دنیا سے متعلق قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اور وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار و اصولِ حیات کے مطابق زندگی۔ بالفاظِ دیگر، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لانا، اسلام ہے۔

اب ہمارے سامنے تین قسم کے گروہ آ گئے۔

(۱) پہلا گروہ ان لوگوں کا جو قوانین فطرت کی متابعت سے (جسے فزیکل سائنس کہتے ہیں) کائناتی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں لیکن مستقل اقدار پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہیں دنیا کے مادی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کا یہاں معاشرہ جہنمی ہو، ان کا مستقبل بھی جہنمی ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو فزیکل سائنس کی رُو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ان کی زندگی یہاں بھی جنتی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی۔

(۳) تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ دنیا کی زندگی، ذلت و خواری اور محتاجی و کس مپرسی کی زندگی ہوگی۔ وہ سامانِ زیست تک کے لئے دوسری قوموں کے دست نگر ہوں گے۔

اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ گروہ، خدا — وحی — آخرت پر ایمان کا مدعی ہو، تو کیا ان کی اُخروی زندگی کامیاب و کامران ہو جائے گی؟ اس کا جواب واضح ہے۔ خدا۔ وحی۔ آخرت۔ یا مستقل اقدار پر ایمان

دنیا اور آخرت کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کیا جائے اب جو قوم فطرت کی قوتوں سے محروم ہے، اس کے لئے ان قوتوں کے صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، خدا۔ وحی۔ آخرت۔ مستقل اقدار وغیرہ پر اس کا ایمان محض لفظی دعوے ہے جو کبھی عمل میں نہیں آتا۔ اور جو ایمان عمل میں نہیں آتا وہ اپنے نتائج کیا پیدا کرے گا؟ یہ خیال غلط ہے کہ اس دنیا میں یہ لوگ خواہ تباہ حال ہی کیوں نہ ہوں، ان کی عاقبت بہرحال سنور جائے گی۔ یہ خیال رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جو انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ اس سے انسان اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ یہاں کی تباہی اور زبوں حالی کا عاقبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ جو یہاں جتنا زیادہ زبوں حال ہوگا وہ عاقبت میں اتنا ہی خوش بخت ہوگا۔ قرآن کریم اس کی کھلے الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قوم پر اس دنیا میں مادی

سامانِ زیست کے دروازے نہیں کھلتے اس کی عاقبت کبھی سنور نہیں سکتی۔ وہ کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ یہاں کی بدحالی ہے۔ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ اور اسے ہم قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قوانین فطرت بھی خدا ہی کے متعین کردہ قوانین ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے یا ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ان قوانین کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حصے سے انکار کرتے ہیں، تو دوسرے حصے کا زبانی اقرار ہمیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ..... (۲/۸۵)۔ جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور وہ قیامت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ قوانین خداوندی کے ایک حصے سے انکار کرنے اور دوسرے حصے پر ایمان رکھنے کا نتیجہ صرف اسی دنیا کی ذلت و خواری نہیں بلکہ آخرت کی تباہی اور بربادی بھی ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) دوسرے حصے (یعنی مستقل اقدار) پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اُسے پہلے حصے (یعنی دنیاوی معاشرہ) میں عملاً نافذ کیا جائے۔ قرآن کریم کے احکام (قوانین، دنیاوی زندگی کو وحی الٰہی کے مطابق صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ہیں۔ حتیٰ کہ صلوٰۃ جیسی "عبادت" بھی اسی حقیقت کی یاد تازہ کرانے اور اس آرزو کو بیدار کرنے کے لئے ہے کہ ہم زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کریں گے۔ ہم اس کے قوانین کے سامنے جھکیں گے۔ لہٰذا، دنیاوی زندگی کو قابلِ اعتنا نہ سمجھنا اور خیال یہ کرنا کہ ہم قوانین خداوندی کی اطاعت کر رہے ہیں، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یاد رکھئے! جسے اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل نہیں یا وہ ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتا وہ قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتا۔ اور اسی لئے اُسے اُس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً مومن کا صحیح شعارِ زندگی ہے۔ اور جس روش کا نتیجہ یہ نہیں، وہ اسلام نہیں۔ کچھ اور ہے۔ ایمان و عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس زمین کی سرفرازی و سربلندی۔ حکومت و سطوت ہے۔ (۲۴/۵۵)۔ یہ خدا کا اٹل وعدہ ہے۔ جس کی دنیا خراب ہے اور وہ اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دین اس لئے آتا ہے کہ وہ انسان کے دنیاوی معاملات سنوار دے۔ انہی معاملات کے سنورنے سے، اس کی عاقبت سنورتی ہے۔ جس قوم کے دنیاوی معاملات سنورے ہوئے نہ ہوں، اور وہ عالم انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات کو سنوارنے کی فکر نہ کرے، سمجھ لیجئے کہ اس قوم کی عاقبت سنوری ہوئی نہیں۔ دین، ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جو انسانی زندگی میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، یہاں سے وہاں تک ایک سلسلۂ صید و صیاد نظر آئے گا جس میں ہر فرد اور ہر قوم کی کوشش ہوگی کہ وہ دوسرے فرد اور دوسری قوم کو اپنا شکار بنائے۔ اس کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔ قسم قسم کے جال بچھائے جائیں گے۔ کوئی ہم رنگِ زمین کوئی مقدس پردوں کی اوٹ میں۔ ہر طاقتور کمزوروں کا خون چوسے گا۔ ہر زیرک، دوسروں کو بیوقوف بنا کر ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے گا۔

دین کی غایت

یوں تو ان شکاریوں کی بہت سی قسمیں ہیں، لیکن اگر ان کی اصولی تقسیم کی جائے تو تین بڑی بڑی شاخیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ مستبد حکومت۔ باطل مذہبی پیشوائیت۔ اور خون آشام نظام سرمایہ داری۔ دین، ان تینوں لعنتوں کو مٹا کر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور محتاج نہ رہے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد وہ کچھ بن سکے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔ غلط معاشرہ میں، جوہر انسانیت کے کروڑوں غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں، لیکن دین کی رو سے قائم کردہ معاشرہ میں، ایک فرد بھی ایسا نہیں رہتا جس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر بہرہ مند نہ ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو عالم انسانیت میں دین کی رو سے برپا ہوتا ہے۔ وہ پہلے اس معاشرہ کو ایک خطۂ زمین میں متشکل کرتا ہے اور پھر اس کے دائرے کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ پوری عالمگیر انسانیت کو اپنے آغوش میں لے لے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے پورے کے پورے صفحۂ ارض سے سلب و نہب اور ظلم و جور کو مٹا کر، عدل و احسان کا نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ساری نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا کر اسے اخوت کے رشتے میں پرو دیتا ہے۔ یہ ہے دین کا مقصود۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

> نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کو، باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے انہیں ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے

ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے دقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدیؐ۔ یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔ (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے نام)

یہ تھا وہ اسلام جسے نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنے بے مثال عمل سے اسے متشکل کر کے دکھا دیا۔ اس "بے مثال عمل" کا مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ اس دین کو لوگوں کے سامنے علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتے تھے۔ اس کی غایت اور حکمت کو دلائل و براہین سے سمجھاتے تھے۔ مخالفین کے اعتراضات کا علم و دانش کی رو سے جواب دیتے تھے۔ انہیں اس پر تدبر و تفکر کی رو سے غور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس طرح، دل و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اسے بطیب خاطر قبول کرتا تھا اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ تھی وہ جماعت جس نے دین کا معاشرہ تشکیل کیا۔ اس جدید معاشرہ نے چند دنوں میں

اسلامی معاشرہ

ایسے انسانیت ساز درخشندہ نتائج پیدا کئے جو اس کی صداقت کا زندہ ثبوت بنتے چلے گئے۔ اس طرح اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اور دنیا نے ایک ایسا نظام دیکھ لیا جس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم تھا، نہ محتاج۔ ہر فرد قوانین خداوندی کے حدود کے اندر رہتے ہوئے سرفرازی اور آزادی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہی وہ آزادی ہے جس سے اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز سے ہو جاتی تھی کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ اسی کو عاقبت سنوارنا کہتے ہیں۔ دین کے اس نظام میں، نہ ملوکیت کا کوئی تصور تھا نہ سرمایہ داری کا۔ نہ خانقاہیت کا کوئی دخل تھا نہ مذہبی پیشوائیت کا۔ احترام آدمیت اس کا شعار تھا اور شرف انسانیت، سوسائٹی میں مدارج کا معیار اس میں، (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) بڑے سے بڑا طاقتور کمزور ترین انسان تھا جب تک اس سے مظلوم کا حق نہ دلوا دیا جاتے۔ اور کمزور سے کمزور انسان سب سے زیادہ طاقتور تھا جب تک اس کا چھنا ہوا حق اسے واپس نہ مل جائے۔

یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے بطور نظام حیات تجویز کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس قوم نے، اس اسلام کی ایک ایک شق کو پس پشت ڈال دیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے لے لی جس میں ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت، پیشوائیت، غرضیکہ وہ تمام عناصر ایک ایک کر کے آ گئے جنہیں اسلام نے آ کر مٹایا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس قوم میں یہ عجیب انقلاب آیا کہ

بعد کا اسلام

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست
خود سر تخت ملوکیت نشست

ان کے دنیاوی معاملات، ارباب حکومت نے اپنے زیر اقتدار لے لئے اور مذہب نام رہ گیا چند نظری عقائد اور بیجان

رسومات کے مجموعہ کا۔ معتقدات میں اس قسم کی بحثیں عقیدۂ ہو گئیں اور ان کے اختلاف پر خون کی ندیاں بہنے لگ گئیں، کہ آدم کی روح درحقیقت خدا کی روح ہے یا اس سے الگ ہے۔ خدا کی صفات قدیم ہیں یا حادث۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ خدا اپنی معلومات کے خلاف بھی ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ انسان اپنے اعمال کا آپ خالق ہے یا نہیں۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ اہلِ جنت کو خدا کا دیدار ہو گا یا نہیں۔ کیا خدا کو اس کی قدرت ہے یا نہیں کہ اہلِ بہشت کی نعمتوں اور اہلِ دوزخ کے عذاب میں کمی بیشی کر سکے۔ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں۔ عذاب و ثواب کا دیا جانا خدا کی مرضی پر ہے یا انسان اپنے عمل سے اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ حوضِ کوثر کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ جنت کے آبخوروں کی ضخامت کتنی بڑی ہے۔ وہاں کے انگوروں کا خوشہ کتنا کتنا بڑا ہے۔ یہ معتقدات کی بحثیں تھیں۔ مسائل اس قسم کے داخلِ تعلیم ہو گئے کہ مسواک کو مٹھی بھر پکڑنے سے بواسیر ہو جاتی ہے۔ مسواک کو چوسنے سے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ دہ در دہ حوض میں آدمی کا پیشاب پڑ جائے تو وہ پاک رہتا ہے۔ کنوئیں میں چوہے کی دُم کٹ کر گر جائے تو اس کا پانی کس قدر نکالنا چاہیئے۔ چوہے کا پیشاب پاک ہے یا نہیں۔ سؤر اگر نمک سار میں گر کر نمک بن جائے تو اُسے کھا لینا چاہیئے یا نہیں۔ لونڈی کا دودھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

یا اس قسم کے مسائل کہ غسل پانی کے کتنے لوٹوں سے کرنا چاہیئے۔ سر کے مسح میں ہاتھ کہاں تک پہنچنا چاہیئے۔ اگر قرأت میں ض اور ظ۔ ص اور س۔ ط اور ت میں فرق نہ کیا جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں۔ وغیرہ

یہ ہیں وہ معتقدات، نظریات اور بیہودہ مسائل جن کے حل کرنے میں قوم کی ساری توانائیاں، وقت اور روپیہ صرف ہونے لگا . . . . آج تک اُمت انہی مباحث میں الجھی چلی آ رہی ہے اور اسے کا نام دین کی خدمت اور جہادِ عظیم قرار پا چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی آخری کتاب 'ارمغانِ حجاز' میں (جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی)، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے عنوان سے ایک طویل، لیکن بڑی دلچسپ اور پُر معنی نظم لکھی ہے جس میں قوم کی اس حالت پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں۔ ابلیس اپنے تمام مشیروں کو جمع کر کے ایک کانفرنس منعقد کرتا ہے تاکہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ ابلیسی پروگرام کو کس گوشے کی طرف سے سب سے زیادہ خطرہ ہے اور اس خطرہ کی روک تھام کس طرح کی جائے۔ لمبی چوڑی بحث کے بعد ابلیس اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے　　　جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس کے بعد وہ اپنا مطلب ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں　　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

وہ شرعِ پیغمبر جو ہر طاغوتی قوت کے لئے سامانِ موت ہے۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر　　　حافظِ ناموسِ زن۔ مرد آزما۔ مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اس کے بعد وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

مشیروں نے پوچھا کہ اس کے لئے ہمیں کرنا کیا چاہیئے؟ اس نے کہا کہ اس کا علاج بہت سہل ہے۔ تم اس قوم کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے　　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے　　　یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　　اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں　　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے　　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

برادرانِ عزیز! ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا جس سے ہمارا (یعنی مسلمانانِ عالم) کا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　　یہ مذہبِ مُلّا و نباتات و جمادات

لیکن وہ اسلام جس نے اُس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، ہمارے پاس آج بھی خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟　والسلام

اِستقبالیہ

(میاں عبدالخالق صاحب صدر کنونشن کمیٹی)

میرے عزیز ترین دوستو! السلام علیکم۔
غالب نے کہا تھا

بھاگے تھے ہم بہت سو اس کی ہے یہ سزا
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پاؤں

میں پچھلے سال کنونشن کے موقعہ پر بھاگ کر یورپ چلا گیا تھا۔ سال بھر وہاں رہنے کے بعد اگست میں واپسی ہوئی تو پرویز صاحب سے ملنے کے لئے لاہور آیا۔ اس وقت سے آج تک بیٹھا تحریک کے پاؤں داب رہا ہوں۔ سو بار توبہ کر چکا ہوں کہ اب کبھی بھاگ کر نہیں جاؤں گا لیکن بھاگنے والوں کو اس مدرسے سے بڑی سخت سزا ملتی ہے معلوم نہیں کب معافی ملے۔

عزیزانِ من۔ یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آپ احباب کو خوش آمدید کہنے کی سعادت اس دفعہ میرے حصے میں آئی ہے۔ گلبرگ میں کنونشن کے شایانِ شان جگہ کا ملنا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور تھا۔ اگر سوال صرف کھلی جگہ کا ہوتا تو یہ مرحلہ کچھ ایسا وقت طلب نہ ہوتا لیکن راولپنڈی کی ۱۹۵۸ء کی کنونشن اور لاہور کی ۱۹۶۰ء کی کنونشن کا منظر میرے سامنے تھا جب بارش کی وجہ سے تھوڑی سی سر چھپانے کی جگہ سایۂ رحمت نظر آتی تھی۔ اس لئے تلاش ایسی جگہ کی تھی جہاں کھلی فضا بھی ہو اور ایسی چھت بھی جس کے نیچے ڈیڑھ دو سو مہمانوں کا قیام ممکن ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض تائیدِ خداوندی تھی جس سے ایسی جگہ کا انتظام ہو گیا۔ اس کے لئے میں اپنے عزیز رفیق چوہدری عبدالرؤف

صاحب کا شکر گذار ہوں کہ جن کے حسن توسط سے یہ انتظام ہوا لیکن حقیقی شکریہ محترم شیخ اخلاص احمد صاحب کا ہے جنھوں نے انتہائی خندہ پیشانی اور وسعت قلب سے اس جگہ کو اس مقصد کے لئے عنایت فرما دیا بلکہ اس کے بعد ہر ضرورت کے لئے پورے پورے تعاون کا ثبوت دیا۔ لاہور بالخصوص گلبرگ کے دوستوں سے میری درخواست ہے کہ اگر ان کے جاننے والوں میں سے کوئی صاحب گلبرگ میں اتنا بڑا مکان بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں تو وہ انھیں بھی خواہ مشورہ دیں کہ وہ تعمیر کا کام سال کے اخیر میں شروع کریں تاکہ آئندہ اپریل تک عمارت اس شکل میں ہو کہ اس پر چھتیں پڑ چکی ہوں لیکن ہنوز رہائش کے قابل نہ ہو وہ انھیں یہ مشورہ دیدیں باقی کام میں خود کروں گا۔

اس مرتبہ کنونشن کے جملہ انتظامات بزم طلوع اسلام لاہور کے ذمہ تھے۔ بزم کے اراکین نے اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں جس خلوص، محبت، تن دہی اور جاں فشانی کا ثبوت دیا ہے میرے دل پر اس کا خاص اثر ہوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک رفیق کا نام لے کر شکریہ ادا کروں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ اگر انھوں نے جواب میں کہہ دیا کہ

لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا

(کہ ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے) تو اس سے میری نگاہیں جھک جائیں گی۔ قرآنی جذبہ سے سرشار احباب واقعی کسی معاوضہ یا شکریہ کے متمنی نہیں ہوتے۔

ان کے ساتھ ہی میرے سامنے کراچی کے احباب کا وہ گروہ آجاتا ہے جو اپنے سب کام کاج چھوڑ کر ایک ہفتہ پہلے لاہور آگئے اور جملہ انتظامات میں میرا اس طرح ہاتھ بٹایا کہ کسی پریشانی کو مجھ تک آنے ہی نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کراچی والوں کا میرے ساتھ وہی قلبی تعلق ہے جو سسرال میں گئی ہوئی لڑکی کے ساتھ اس کے میکے والوں کا ہوتا ہے مجھے ان کے اس تعلق پر بڑا ناز ہے۔ میں سسرال والوں کی شکایت نہیں لیکن جس کے میکے والے ایسے ہوں وہ اس پر جتنا ناز بھی کرے کم ہے۔

میں ان تمام رضا کاروں کا بھی سپاس گذار ہوں جو بطیب خاطر مختلف شہروں سے آئے اور انھوں نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لیں۔

جو احباب سرگودھا سے کنونشن میں شریک ہوئے تھے ان کی زبان وہاں کے کھانے کے تصور سے اس وقت تک لطف اندوز ہو گی۔ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ برادر عزیز چوہدری محمد نصر اللہ خاں صاحب کھانا پکانے کے اُن ہی انتظامات کو ساتھ لے کر آئے ہیں اور یہاں بھی آپ کو وہی لذت ملے گی جس سے آپ سرگودھا میں کیف اندوز ہوئے تھے۔

برادرانِ عزیز۔ ہم نے حسب معمول کوشش کی ہے کہ آپ کو یہاں کے قیام کے دوران حتی الامکان آرام ملے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ بایں ہمہ اگر ہمارے انتظامی نقص کی وجہ سے کسی صاحب کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو وہ اس کا کوئی اثر دل پر لئے بغیر اسے ان رضاکاروں کے نوٹس میں لے آئیں جنہیں اس خدمت کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ پھول چنتے وقت کانٹا چبھ جائے تو نگاہ پھول کی شگفتگی اور شادابی پر رکھنی چاہیے کانٹے کی خلش پر نہیں۔ کانٹے تو چبھتے ہی رہتے ہیں پھول روز روز کہاں کھلتے ہیں۔

مالی اعتبار سے کنونشن ابھی تک خسارے کا سودا چلا آرہا ہے۔ اور شاید یہ سودا رہے گا بھی ایسا ہی سال گذشتہ کی کنونشن میں کل آمدنی ۲۲۵۵/- روپے تھی اور اخراجات کی میزان ۳۶۳۳/- روپے تھی۔ اس اعتبار سے اس کا خسارہ ۱۳۸۲/- روپے تھا جسے مجلس عاملہ کی طرف سے پورا کیا گیا۔ امسال اخراجات کا اندازہ سال گذشتہ سے بھی زیادہ ہے۔ بہرحال اس خسارے میں اگر وہ متاعِ گراں بہا ہاتھ آجائے جو اس اجتماع کا حاصل ہے تو اسے کون خسارے کا سودا کہے گا۔ یوسف تو کسی قیمت پر بھی مہنگا نہیں ہوتا میرا اعتبار نہ ہو تو زلیخا سے پوچھ لیجئے۔

عزیزانِ من! آپ کو شاید یہ یاد نہیں رہا ہوگا کہ میں صرف آپ کی کنونشن ہی کا خادم نہیں ہوں۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کا بھی آنریری مینجنگ ڈائرکٹر ہوں۔ آنریری کے معنی ہوتے ہیں وہ جو گائے کے سینگوں کو تھامے رکھے اور دودھ میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ میں یہ عرض کردوں کہ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ایک بالکل مختلف ادارہ ہے جسے نہ ادارہ طلوع اسلام سے کوئی تعلق ہے نہ آپکی کنونشن سے لیکن اس لاتعلقی کے باوجود اسے آپ کی تحریک سے ایسا گہرا تعلق ہے جیسا جسم کا روح کے ساتھ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے قبل صورت یہ تھی کہ محترم پرویز صاحب ہمیں قرآنی فکر بھی دیتے تھے پھر اس فکر کو خود ہی لکھتے بھی تھے پھر اس لکھے ہوئے کو خود ہی چھپواتے بھی تھے اور شائع بھی کرتے تھے۔ احباب نے محسوس کیا کہ اس طرح اس عظیم مفکر کا کتنا وقت اور توانائی ایسے کاموں میں صرف (بلکہ ضائع) ہو رہی ہے جس کا فکری دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ انہیں ان پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے نام سے ایک کاروباری ادارہ قائم کیا گیا جس کا اولین مقصد پرویز صاحب کی تصانیف کی طباعت و اشاعت قرار پایا۔ اور اس نے جنوری ۱۹۶۱ء میں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد شائع کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سابقہ کنونشن میں مفہوم القرآن کے سولہ صفحات بطور نمونہ بھی پیش کر دیئے۔

کاروبار کو چلانے کے لئے سرمایہ اگرچہ واحد ذریعہ نہیں لیکن اہم جزو ضرور ہے۔ سرمایہ کے اعتبار سے میزان زیادہ خوش نصیب واقع نہیں ہوئی۔ بایں ہمہ ہم نے جو پروگرام اپنے سامنے رکھا تھا اس کے مطابق مفہوم القرآن

کے چار پارے بلاک پر منٹنگ میں پیش کر چکے ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مفہوم القرآن جیسی بلند پایہ کتاب کا حلقہ محدود ہونا چاہیئے لیکن آپ یہ سن کر متعجب اور مسرور ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے خاص مقبولیت عطا فرمائی ہے۔ پارہ اول کا اعلیٰ ایڈیشن دو بار چھپ چکا ہے۔ اسی طرح پارہ دوم، سوم اور چہارم چھپ چکے ہیں۔ مفہوم القرآن اول کا سستا ایڈیشن خاص تقاضوں کے ماتحت شائع کیا گیا تھا اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا زیر طبع ہے۔

آپ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ طلوعِ اسلام کی تحریک کا واحد مقصد ذہنوں میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے اور اس کا بنیادی ذریعہ قرآنی لٹریچر ہے۔ میزان اس لٹریچر کو شائع کرنے کی مشینری ہے۔ یہ لٹریچر جس قدر عام ہوگا اتنے ہی زیادہ اس ذہنی انقلاب کے رونما ہونے کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے سستا لٹریچر شائع کرنا بھی ازبس ضروری ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ طبقہ کے ہاتھوں تک پہنچ سکے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس ضمن میں میزان نے اپنے سامنے ایک ضروری پروگرام رکھ لیا ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ "اسباب زوالِ امت" جیسی بنیادی کتاب کا سستا ایڈیشن محترم پرویز صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کر دیا گیا ہے جو کہ بکثرت سے صرف ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔ دوسری کتاب ـــــ قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں۔ زیرِ طباعت ہے۔ ہم اس سلسلے کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کریں گے۔

پرویز صاحب کی تصانیف کے علاوہ میزان کے پیشِ نظر دیگر ایسی کتابوں کی اشاعت بھی ہے جو بالواسطہ اس ذہنی انقلاب کے لئے ممد و معاون ہوں۔ اس سلسلہ میں علامہ احمد امین مصری کی عظیم تاریخ ـــــ "ضحی الاسلام" "اسلام پر کیا گذری" ـــــ شائع کی گئی ہے۔ عنایت اللہ صاحب کی مقبول عام تصنیف "دھتکارے ہوئے انسان" بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ اپنے دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میزان سے متعلق کام "فرضِ کفایہ" ہے۔ جیسے میزان والے خود ادا کر رہے ہیں اور ادا کرتے رہیں گے۔ اور اس سلسلہ میں ہمارے کرنے کا کام کچھ نہیں۔ لیکن برادرانِ عزیز! آپ یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن نہ کریں یہ فرضِ کفایہ نہیں۔ فرضِ عین ہے اس میں آپ حضرات نے بھی برابر کا حصہ لینا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ لٹریچر زیادہ سے زیادہ منگائیں اور اسے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچائیں۔ خود بھی پیشگی خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے زیادہ میزان والے آپ سے کچھ نہیں چاہتے۔ دیکھا! آپ جس بات سے جی میں ڈرتے تھے میں نے اس کا نام تک نہیں لیا یعنی چندہ بالکل نہیں مانگا اس لئے اب تو خوش ہو جایئے اور جو فریضہ آپ کے ذمہ لگایا ہے اسے ادا کیجئے۔

میں ان تمام بزرگوں کا بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے میری درخواست پر ہمارے ہاں سے لٹریچر منگوا کر اپنے

اپنے حلقہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے لٹریچر کی مانگ دن بدن بڑھ رہی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ وہ آیندہ بھی ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون فرمائیں گے۔

بعض دوست یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن سمجھنے کے بعد اب ہم عمل کیا کریں میں کہتا ہوں کہ آپ واقعی عمل کرنا چاہتے ہیں تو پہلا عمل یہ ہے کہ قرآنی فکر کو عام کرکے وہ ذہنی انقلاب پیدا کریں کہ جس کے بعد سارے قرآن پر عمل کرنا بالکل آسان ہو جائے گا۔

برادرانِ عزیز! میں ایک بار پھر آپ احباب کی تشریف آوری پر دلی ہدیۂ تبریک تہنیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہماری یہ کنونشن ہر اعتبار سے کامیاب و کامران رہے۔ والسلام

اسلامی معاشرت

از پرویز

بچوں، عورتوں، کم تعلیمیافتہ لوگوں کے لئے زندگی کے روزمرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کریم کے احکام —— قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ: میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

مفت

دوا برائے دمہ و درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ: حاجی محمد دین شیخ اٹس فیکٹری متصل گنیش کمو پڑ املز۔ لارنس روڈ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگا لیں

رپورٹ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

رفقائے محترم! السلام ورحمت

للہ الحمد کہ چند سال قبل قرآنی فکر کی جس دعوتِ انقلاب کو لے کر ہم منظم طور پر آگے بڑھے تھے وہ اب اپنی نشر و اشاعت کے کئی خوشگوار مرحلے کامیابی سے طے کر چکی ہے اور ہمارا کاروانِ شوق عزم و ہمت سے منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں ہے۔ قرآنی فکر کا یہی تھا سادیا تھا جسے کوئی چالیس برس ادھر ہمارے قافلہ سالار نے اپنے خونِ جگر سے روشن کیا تھا اور آج دیکھئے کہ زندگی کی کتنی تاریک راہیں اس کی روشنی سے منور ہو رہی ہیں۔ پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے سینکڑوں گھرانوں میں روشنی اب سرمایۂ حیات قرار پا گئی ہے اور ہزاروں قلوب و اذہان اس کی کرنوں سے جگمگا اٹھے ہیں۔ تاریخِ دین کی داستانِ عروج و زوال کے اوراق دلئے اور اس کا تصور کیجئے کہ کتنی بڑی سعادت تھی جو اس دور میں آپ کو نصیب ہوئی۔ خدا آپ کی اس مساعی جمیلہ کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازتا رہے۔

یادِ رفتگاں بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اس نمائندہ سالانہ اجتماع میں مسرتوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ ایک داغِ غم بھی موجود ہے۔ اور اپنی رپورٹ کا آغاز کرتے ہوئے انتہائی درد بھرے احساس سے میں ان رفقائے جلیل کی رحلت پر اظہارِ تعزیت کرتا ہوں جن کی بیش بہا رفاقت سے ہم گذشتہ چند ماہ میں موت کے ہاتھوں محروم ہو گئے۔ بزم راولپنڈی کے سرگرم نمائندہ چوہدری فیروز علی بھٹی۔ بزم رسول نگر کے ممتاز سرپرست خان بہادر قاضی حفیظ الدین۔ زروبی (ضلع مردان) کے خادمِ خلق اور عاشقِ قرآن ڈاکٹر عبد الغفار، یہ سب قابلِ قدر رفقائے سفر تھے جو دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے جدا ہو گئے۔ ان کی یاد مدتوں ہمارے دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔ خدا ان سب کو ان کے

عشقِ قرآنی کی بنا پر انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ قانونِ طبیعات کی رو سے ہر تحریک کو ایسے حادثوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اسی بنا پر ہمارے لئے بھی ان المناک مرحلوں سے گریز ممکن نہیں۔

رابطۂ باہمی

اس وقت پاکستان کے طول و عرض میں چھیالیس بزمیں موجود ہیں اور پاکستان سے باہر ان کی تعداد تین ہے۔ ان بزموں کا ادارہ سے باضابطہ ربط اور الحاق قائم ہے اور قرآنی فکر کی منظم طور پر اشاعت ان کا نصب العین۔ گذشتہ سال کے آخر تک ان بزموں کا نظام مجلس عاملہ کی نگرانی میں تھا اور مجلس عاملہ ادارہ کے زیر ہدایت یہ فریضہ ادا کر رہی تھی لیکن مجلس عاملہ کی حیثیت ترکیبی اس نوعیت کی تھی کہ یہ تجربہ حسبِ توقع کامیاب نہ ہو سکا اور یکم جنوری ۱۹۶۲ء سے ادارہ نے بزموں کا نظام اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب بزمیں ادارہ کی نگرانی میں کام کر رہی ہیں۔ ان کی رپورٹیں ادارہ میں موصول ہوتی ہیں۔ ادارہ ہی ان کی کارکردگی کا جائزہ لیتا ہے اور اسی کے زیرِ اہتمام ان رپورٹوں کی اشاعت ہوتی ہے۔

بزموں کی کارکردگی

بزمِ لندن نے گذشتہ چند ماہ میں جو سرگرمی ظاہر کی ہے اور اس کے اجتماعات نے علمی حلقوں میں جو مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ ایک درخشندہ مثال کا درجہ رکھتی ہے۔ بزمِ کراچی کا منظم طریق کار، اس کے کارکنوں کا ربط و ضبط اور جوششِ عمل بھی ہماری بزموں کے لئے نشانِ راہ سے کم نہیں۔ راولپنڈی، کوئٹہ، بوریوالہ، سرگودھا، چنیوٹ اور ریجن کسی کی کارگذاری بھی بڑی حد تک اطمینان بخش ہے۔ ان بزموں کے علاوہ دیگر بزموں سے کچھ نہ کچھ گلہ ضرور ہے۔ ان بزموں کو غور کرنا چاہیئے کہ حالات کے تقاضے ان سے کس قدر جد و جہد اور فرض شناسیوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر اس مطالبہ کو سرگرمی سے لبیک نہ کہا گیا تو قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ان سے کونسی توقعات وابستہ کی جا سکیں گی۔ جو کچھ کہا گیا ہے اسے اپنے متعلق نفاذ شکایت نہ سمجھئے۔ یہ گذارشِ احوال واقعی ہے جسے "اہلِ خاندان" میں پیش کرنا میرے فریضہ میں داخل ہے۔

لغات القرآن اور مفہوم القرآن کا سلسلۂ اشاعت

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے ہر مرحلہ پر قرآن فہمی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کے سلسلۂ اشاعت سے قبل یہ معاملہ بڑا کٹھن سمجھا جاتا تھا اور اس راہ میں بڑی مشکلات حائل تھیں لیکن مقامِ مسرت ہے کہ اس سلسلۂ اشاعت نے ان مشکلات کو خوش اسلوبی اور حسنِ انداز سے حل کر دیا ہے۔ اور قرآن کے زندۂ جاوید پیغام کو سمجھنے اور سمجھانے میں اب کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ پرویز صاحب کی سالہا سال کی عرق ریزیاں اور جگر کاریاں منظرِ اشاعت پر آ رہی ہیں اور یہ شاہکار ان کی زندگی میں ہی کسبِ فیض کا سرچشمہ بن گئے ہیں۔ قرآن کے عالم آرا حقائق کی نقاب

کش ہو رہی ہے اور خدا کی آخری اور زندہ جاوید کتاب کو ریشمیں غلافوں اور ایصالِ ثواب کی چار دیواری سے نکال کر علم و بصیرت کی روشن فضا میں لایا جا رہا ہے۔ بہت سی بزموں نے لغات القرآن اور مفہوم القرآن کے درسوں کا اہتمام کر رکھا ہے اور کئی بزمیں اپنے ہاں ایسے انتظامات میں کوشاں ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہماری بزمیں ان شاہکاروں کی اہمیت کو سمجھیں اور قرآن کی روشنی سے فضا کو منتیر بنانے میں پیش از پیش سرگرم کار ہوں۔

ہفتہ واری درس

ہر اتوار کی صبح کو پرویز صاحب کی قیام گاہ پر درس قرآن کا سلسلہ کامیابی سے جاری ہے۔ اس کی افادیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ قرآنی فکر سے مستقلاً وابستہ احباب کے علاوہ بڑے صاحب علم، روشن دماغ اور بلند نظر اصحاب اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں اور پھر آئندہ درس تک ان کی علمی مجلسوں میں اس کے چرچے رہتے ہیں۔

مزید براں بعض غیر مسلم حضرات نے بھی بڑے ذوق و شوق سے درس میں شرکت شروع کر رکھی ہے۔ وہ قرآن کا پیغام جھوم جھوم کر سنتے ہیں اور آئندہ درس کا شوق آرزو سے انتظار کرتے ہیں۔ یہ وابستگی اور ذوق و شوق اس حقیقت کی شہادت ہے کہ خدا کے اس آخری پیغام میں نوعِ انسانی کے لئے کس قدر کشش اور حیات بخشیوں کے سامان موجود ہیں۔

درس قرآن کی یہ آواز ٹیپ ریکارڈروں کی وساطت سے پاکستان اور بیرونی ممالک میں بھی پہنچ رہی ہے۔ لندن، کراچی، راولپنڈی، ملتان، پشاور اور دہران کی بزمیں اپنے ہاں ٹیپ ریکارڈ سے اس پیغام کو نشر کرنے کے انتظامات کر چکی ہیں اور بہت سی دیگر بزمیں اس کی تیاری میں لگی ہیں۔ قرآن کا پیغام ان ذرائع اور وسائل سے ہر گوشہ میں اپنی روشنی پھیلاتا جا رہا ہے اور اسے ایک بار پھر بین الاقوامی پیغام کی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔

پرویز صاحب کے دورے

مفہوم القرآن کی تیاریوں نے گذشتہ سال سے پرویز صاحب کو بیحد مصروف رکھا۔ اسی بنا پر ان کا کراچی کا سالانہ دورہ بھی التوا میں پڑ گیا۔ کراچی کا یہ سالانہ دورہ بڑے دور رس، خوش آیند اور بصیرت افروز اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ پرویز صاحب اس کی اہمیت سے باخبر ہیں اور امید کرنی چاہیئے کہ وہ جلد ہی گوناگوں مصروفیتوں سے فراغت پاکر اس معاملہ میں تلافیٔ مافات کی سعی فرمائیں گے۔

لیکن اپنی ان ناگزیر مجبوریوں کے باوجود، پرویز صاحب نے سرگودھا، راولپنڈی اور سیالکوٹ کے مختصر دوروں کے لئے وقت نکال ہی لیا۔ یہ مختصر دورے بڑے کامیاب رہے۔ اور ہزاروں افراد کو بڑے اہم علمی موضوعات سے متعلق ان کے خطابات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۲۳ سے فہرست میں دیکھیئے)

عورت کا مسئلہ

★ طلوعِ اسلام کنونشن میں ★

بزمِ خواتین کی تقاریر

(پروفیسر شمیم انور کی انگریزی تقریر کا الگ پمفلٹ شائع ہو رہا ہے)

بابِ اوّل

چھوٹی چھوٹی بچیاں

(۱) اسلامی معاشرہ

(عزیزہ روبینہ - ساتویں جماعت کی طالبہ)

معزز حاضرین و حاضرات!

خدا کی طرف سے انسانوں کو ایک ضابطۂ حیات ملا ہے۔ زندگی کے غیر متبدل اصول ملتے ہیں اور ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ لیکن اگر ان اصولوں کے باوجود ہم اپنی عملی زندگی میں ان کو استعمال میں نہ لائیں تو اس علم کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کی بہترین مثال مریض دوا اور شفا کی ہے۔ جب گھر میں کوئی مریض ہوتا ہے تو ہم پہلے دیکھتے ہیں کہ بہترین ڈاکٹر کونسا ہے۔ اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ اس کی لیاقت قابلِ اعتماد ہے۔ اس یقین کو ایمان کہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ڈاکٹر کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد آرام سے بیٹھے رہیں تو اس کا ہمارے مریض کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ چنانچہ اگلا قدم یہ ہوگا کہ ڈاکٹر کے پاس چل کر جائیں گے۔ وہ مرض کی تشخیص کرے گا۔ نسخہ لکھ کر دے گا پرہیز بتائے گا۔ لیکن اگر ہم نسخہ گھر لا کر مریض کے سرہانے رکھ چھوڑیں تو پھر بھی مریض کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ساری عمر سرہانے پڑا رہے مریض کو شفا نہیں ہوگی۔ چنانچہ اصل چیز اس نسخہ کا استعمال اور صحیح استعمال ہے۔ اگر ہم نسخہ کے اجزا میں اپنی مرضی سے رد و بدل کر لیں تو مرض گھٹنے کے بجائے اور بڑھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو شفاءٌ لما فی الصدور کہا ہے۔ یہ انسانیت کی نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے جو قلب کو مضطرب رکھتی ہے۔ لیکن جس طرح ڈاکٹر کی قابلیت پر اعتماد رکھنا یا ڈاکٹر سے نسخہ لے کر سرہانے رکھ چھوڑنا مریض کو صحتیاب نہیں کر سکتا اسی طرح قرآن کے ضابطۂ حیات پر ایمان لانا اور اس پر عمل نہ کرنا انسانیت کی امراض کے لئے شفا نہیں بن سکتا۔ قرآن کریم نے ہر مقام پر ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم کے اصولوں پر عمل مثبت نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ کا قیام ہے اور آخرت میں بھی جنت ہے۔ جنت ایک جزا ہے اچھے اعمال کی اور جہنم سزا ہے بُرے اعمال کی۔

جب تک امتِ مسلمہ قرآن پر عمل کرتی رہی کامیابی اور کامرانی اس کے قدم چومتی رہی۔ لیکن جب غیر قرآنی

تصورات مسلمانوں کے اندر آگئے تو ترقی تنزل میں بدل گئی - نبی اکرمؐ کے تئیس سالہ عمل کا نتیجہ چھتیس ہزار شہروں اور قلعوں کی فتح میں نمودار ہوا - لیکن اسی رسولؐ کے نام لیوا آج قرآن چھوڑنے کے بعد اپنی روٹی کے لئے دوسری اقوام کے دست نگر ہیں - جب تک قرآن پر عمل رہا کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والوں نے دنیا سے بڑی سے بڑی باطل تہذیبوں کو ملیامیٹ کر دیا - جب قرآن پر عمل کے معنی وہ نہ رہے جو رسولؐ اکرمؐ نے بتلائے تھے تو ذلت اور خواری کے سوا پاس کچھ نہ رہا - آج قرآن پر عمل کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ اس کے الفاظ دہراتے جاؤ - یا اس کی آیات کو بطور تعویذ استعمال کر لو - آج غیر قرآنی تصورات اصل دین سمجھے جاتے ہیں - اور نتیجہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے لیکن آج بھی اگر قوم کا ایمان ہو کہ قرآن اللہ کا دیا ہوا واحد مکمل اور آخری ضابطۂ حیات ہے اور یہ کہ قرآن کے قوانین کا ملنا ان کا پڑھنا اور سمجھنا ایک مقصد کا ذریعہ ہے - اور وہ مقصد ان قوانین کے مطابق معاشرہ کی تعمیر ہے تو آج پھر وہی عظمتِ رفتہ واپس لوٹ سکتی ہے - اور آج پھر ہم ان بلندیوں پر پہنچ سکتے ہیں جن کا تصور بھی دنیا کی دوسری قومیں نہیں کر سکتیں -

اسلامی معاشرت

(عزیزہ عفت آراء - ساتویں جماعت کی طالبہ)

میرے محترم بزرگو ! السلام علیکم !

میں جب چھوٹی سی تھی اور چوتھی جماعت میں قدم رکھا تو میرے اباجی نے مجھے ایک کتاب جس کا نام "اسلامی معاشرت" ہے لا کر دی - پہلے تو میں سمجھی کہ یہ کتاب میرے بس کی بالکل نہیں ہے اور اس کو پڑھ کر میں کیا سمجھ سکتی ہوں یہی بات میں نے اپنے اباجی کو بتلا دی - میرا جواب سن کر انہوں نے کہا کہ یہ کتاب بہت آسان زبان میں لکھی گئی ہے اور اگر تم تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھو تو تمہاری سمجھ میں آجائے گی کیونکہ اس میں ہم لوگوں کے لئے روزانہ زندگی قرآن کے مطابق گزارنے کے طریقے اور ہدایات بڑی اچھی طرح پیش کئے گئے ہیں -

اب میں نے اس کتاب کو جس طرح اباجی نے پڑھنے کی ہدایت کی تھی - پڑھنا شروع کر دیا - میں روزانہ ایک یا دو صفحے پڑھتی اور اگر کچھ مشکل پیش آتی تو ابا جان سے پوچھ لیا کرتی - رفتہ رفتہ میں نے ساری کتاب ختم کر لی - اگرچہ کئی باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں کیونکہ ان کو سمجھنے کے لئے میں ابھی بہت چھوٹی تھی -

سب سے پہلی بات جو میں نے سیکھی - وہ یہ کہ میں اپنے بھائیوں بہنوں اور والدین کے ساتھ کس طرح رہوں

اور میرا سلوک ان کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے۔ اباجی نے فوراً میری رہنمائی کی اور قرآن کریم کی یہ آیت میرے سامنے پڑھی۔

وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی

جس کے معنی بھی انہوں نے بہت اچھی طرح مجھے سمجھا دیئے کہ ماں باپ کے ساتھ اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ بھائیوں بہنوں کے ساتھ مل جل کر رہو۔ اور ذرا ذرا سی بات پر ان سے ناراض اور لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار نہ ہو جاؤ۔ صرف ماں باپ اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنے کے لئے ہی مجھے نہ بتلایا گیا بلکہ اپنے گھر میں جو ملازمین کام کرتے ہیں ان سے بھی اچھی طرح پیش آنے کی تاکید ملی۔ یہ بھی بتلایا گیا کہ ہمیں اپنے ہمسایوں کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیئے اور ان سے کیسا میل جول رکھنا چاہیئے۔ ایک واقعہ سنئے۔ ہمارے پڑوس میں ایک خاندان رہتا تھا۔ گھر میں ایک سب سے بڑے بزرگ بھی رہا کرتے تھے۔ جب کبھی میں ان کے گھر پر جاتی تو یہ دیکھتی کہ گھر کے بچے اُن بزرگ یعنی اپنے دادا ابا کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ کیونکہ میں پڑھ چکی تھی کہ چھوٹوں کو اپنے بڑوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ میں نے اُن بچوں سے کہا کہ ہم سب خدا کے فضل و کرم سے مسلمان ہیں اور قرآن کریم ہم کو تاکید کرتا ہے کہ ہمیں اپنے بزرگوں کے ساتھ تواضع سے پیش آنا چاہیئے۔ اور قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔۔۔ (اور والدین سے نیک سلوک کرو)۔ تو وہ بچے اس بات سے متعجب اور متاثر ہوئے اور اپنی پچھلی غلطیوں پر شرمندہ نظر آنے لگے۔ میں نے کہا کہ اگر تمہارے دادا ابا کسی معمولی سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں اور برا بھلا کہنے لگتے ہیں تو تم برا نہ مانو۔ بڑھاپے میں انسان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ طبیعت چڑچڑی ہو جاتی ہے۔ مزاج میں بچپن آ جاتا ہے۔ یہ اُن کے بس کی بات نہیں ہوتی یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ تم ان سے بدتمیزی سے نہ بولو۔ ادب اور احترام کے ساتھ ان کا کہنا سنو۔ ان کو جھڑکو مت بلکہ ان سے عزت اور ادب کے ساتھ بات چیت کرو۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھو اور اللہ سے دعا کرو کہ جس طرح انہوں نے ہمیں پال کر پرورش کر کے بڑا کیا اب ہم بڑے ہو کر جبکہ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں ان کی خدمت اسی محبت اور پیار سے کریں جس طرح سے کہ انہوں نے جب ہم بچے تھے۔ ہماری پرورش کی تھی۔

میرے ہمسائے بچے یہ باتیں سن کر تعجب سے کہنے لگے کہ یہ باتیں ہمیں آج تک نہیں بتلائی گئیں۔ ہم تمہارا احسان مانتے ہیں اور آئندہ کبھی اپنے بزرگوں سے ایسا سلوک نہ کریں گے۔ اس کے بعد میں نے ان کو کتاب "اسلامی معاشرت" دے دی اور انہوں نے اُس کے ایک ایک مضمون کو پڑھا اور بہت سی اچھی باتیں سیکھ لیں۔

میں بھی اس کتاب کو بار بار پڑھتی رہتی ہوں اور اپنی ہم جماعتوں کو بھی پڑھواتی رہتی ہوں۔ تاکہ قرآنی تعلیم کا یہ خلاصہ ہمیں یاد رہے۔ بہت سی اچھی باتیں جو میں نے اسلامی معاشرت سے سیکھی ہیں ان میں سے کچھ

میری بہنیں بھی سن لیں۔ مثلاً

(۱) جو بات بھی کی جائے وہ صاف۔ سیدھی اور واضح ہو جس میں کسی قسم کا اینچ پینچ نہ ہو۔ اُس کے دو معنی نہ نکلیں

قولوا قولاً سدیداً

(۲) اچھی اور مہذب گفتگو کرو۔ ایسی زبان بولو جو شریفوں میں بولی جاتی ہے۔

قولوا قولاً معروفاً

(۳) جھوٹ۔ فریب۔ چالبازی اور بناوٹ کی باتیں کبھی نہ کرو۔

(۴) کوئی ایسی بات نہ کرو جس سے کسی پر زیادتی یا ناانصافی ہو جائے۔

(۵) سچ بولو۔ اور سچ کو مت چھپاؤ۔

(۶) آواز میں نرمی پیدا کرو۔ اور چیخ چیخ کر نہ بولو۔

(۷) فضول اور مہمل باتیں نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنے بہنوں اور بھائیوں اور اپنے ہم عمر ساتھیوں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ ان قرآن کریم کی بتلائی ہوئی ہدایات پر عمل کر کے اپنے اور اپنے والدین کے لئے سعادت کا موجب بنیں۔ السلام علیکم

۔ جڑ کی خبر لیجئے

(عزیزہ سلمیٰ - آٹھویں جماعت کی طالبہ)

میرے قرآنی بزرگو! آپ کی بیٹی سلام کہتی ہے۔ اس کنونشن میں آنے سے آپ کو جس قدر خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ تو آپ ہی لگا سکتے ہیں، لیکن ہم بچوں کو اس کا انتظار ایسے ہی رہتا ہے جیسے روزہ داروں کو انتیس کے چاند کا۔ ہمیں افسوس اس کا ہے کہ عید کے چاند کی طرح، یہ کنونشن بھی سال کے بعد آتی ہے۔ عید تو ہر مہینے اس لئے نہیں آسکتی کہ اس سے پہلے مہینے بھر کے روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ آپ کی کنونشن ہر مہینے کیوں نہیں آسکتی۔ کیا آپ کو بھی اس کے لئے روزے رکھنے پڑتے ہیں۔ آپ کنونشن میں بڑی بڑی علمی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ کی بیٹی آپ کو ایک بڑی مزیدار ہنسی کی بات سنانا چاہتی ہے۔ ہماری کوٹھی میں کچھ پیڑ لگے ہوئے ہیں۔ ایک رات سخت آندھی آئی جس سے ایک پیڑ جڑ سے اکھڑ کر گر پڑا۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ ہمارے مالی کا لڑکا، اُس پیڑ کے پتوں پر فوار

سے پانی چھڑک رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ دتے! یہ کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا کہ بی بی جی! اس کے پتے مرجھا رہے ہیں۔ ان پر پانی چھڑک رہا ہوں تاکہ ہرے ہو جائیں۔ اُس کی بات سُن کر ہم سب ہنسے۔ کئی دنوں تک اس کا چرچا رہا کہ پیڑ جڑ سے اکھڑ گیا ہے اور یہ پتوں پر پانی چھڑک رہا ہے کہ وہ ہرے ہو جائیں!

آپ بھی اس بات پر ضرور ہنسے ہوں گے۔ لیکن میرے بزرگو! اگر آپ اِس بٹیا کی بات کا بُرا نہ منائیں تو سوچیے کہ کیا آپ بھی یہی نہیں کر رہے کہ آپ کے بچوں کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہو رہی ہے اور آپ پتوں پر پانی چھڑک رہے ہیں آپ ہمارے کھانے پینے کا بہت اچھا انتظام کرتے ہیں۔ اچھے اچھے کپڑے بنوا کر دیتے ہیں۔ ہماری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اسکول کی فیس ادا کرتے ہیں۔ کتابوں کا خرچ برداشت کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو ہماری زندگی کے درخت کے پتے ہیں۔ اس کی جڑ وہ تعلیم ہے جو ہمیں مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ وہ تعلیم کس قسم کی ہے؟ اُس تعلیم میں اس قسم کے کیڑے ہیں جو جڑ میں لگ جائیں تو پتوں کو لاکھ پانی دیجیے، زندگی کا درخت کبھی ہرا بھرا نہیں ہو سکتا۔

میرے بزرگو! ہم بڑے نازک پودے ہیں۔ ہمارے پتوں پر ہی پانی نہ چھڑکتے رہیے۔ ہماری جڑوں کا بھی کچھ خیال کیجیے۔ خدا کرے کہ ہماری قوم کے اللہ دِتوں کی سمجھ میں یہ بات آ جائے۔　　　　والسلام

بھیڑ چال کا علاج

(عزیزہ نجمہ۔ نویں جماعت کی طالبہ)

میرے بزرگو!　السلام علیکم

میری بہن سلمیٰ! بڑی شریر ہے۔ یہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ آپ اس کا بُرا نہ منائیں۔ پچھلے دنوں اُردو کی استانی، کلاس میں یہ سمجھا رہی تھی کہ یہ جو محاورہ ہے "بھیڑ چال"؛ اِس کا مطلب کیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ بھیڑوں کی عادت یہ ہے کہ جس طرف اگلی بھیڑ جائے، پچھلی بھیڑیں، بلا سوچے سمجھے، سب اُسی طرف چلتی جائیں گی، خواہ راستے میں کھائی اور گڑھا ہی کیوں نہ آ جائے —— اس کے بعد امتحان کے پرچے میں سوال آیا کہ "بھیڑ چال" کے محاورہ کی تشریح کرو۔ سنیے کہ اس کے جواب میں اس میری بہن نے کیا لکھا تھا۔ اس نے لکھا کہ —— "بھیڑ چال سے

مراد ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اگلی بھیڑ نے اپنی قمیص کو ایک گرہ لمبا کیا تو پچھلی بھیڑوں کی قمیصیں زمین کو چھونے لگ گئیں۔ اُس نے ذرا پائنچے کو بڑا کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پچھلی بھیڑوں کے غرارے بالکل لہنگے بن رہے ہیں۔ ایک نے کرتہ پھیلایا تو سب پھول کر غبارے بن گئیں۔ اُس نے لباس کو ذرا اسکیڑا، تو باقی بھیڑیں یوں نظر آنے لگیں جیسے کوکاکولا کی بوتلیں ہوں۔ ایک نے ذرا بال ترشوائے تو باقی سب منڈی ہوئی بھیڑیں بن گئیں۔ اس نے ایک چٹیا بڑھائی تو انہوں نے معاملہ تین تین تک پہنچا دیا۔ اگر ایک نے اتفاق سے سیاہ رنگ کی قمیص پہن لی تو باقی سب کالی جھنڈیاں بن گئیں۔ ابھی کل کی بات ہے۔ ایک ولایتی بھیڑ نے یونہی تفریحاً جناح کیپ اپنے سر پر رکھ لی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ساری دیسی بھیڑیں دوپٹوں کے اوپر ٹوپیاں پہنے چلے جا رہی ہیں۔ اسے کہتے ہیں بھیڑ چال۔

اس بھیڑ چال کا علاج کسی نے خوب سوچا ہے۔ اُس نے تمام لڑکیوں کے لئے یونیفارم مقرر کر دی۔ اب نہ قمیص کی لمبائی میں فرق آتا ہے نہ پاجامے کے پائنچے کی چوڑائی میں۔ نہ کپڑوں کا رنگ بدلتا ہے، نہ سائز۔ سب کی وضع قطع ایک۔ سب کا رنگ ڈھنگ یکساں۔

اسی قسم کی یونیفارم، آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے، سرزمین حجاز کی درسگاہ میں مقرر ہوئی تھی۔ اُس نے ساری قوم کے لئے زندگی کا ایک لباس مقرر کر دیا تھا۔ اور اُس لباس کی پیمائش اور ماپ ایک کتاب میں لکھ کر محفوظ کر دی تھی۔ یعنی ساری قوم ایک طرح سوچتی تھی اور ہر کام ایک طرح کرتی تھی۔ نہ کوئی اختلاف تھا نہ تفرقہ۔ تمام قوم خدا کی کتاب کے مطابق چلتی تھی۔ یہ مطلب ہے میرے کہنے کا کہ اس قوم کے لئے ایک یونیفارم مقرر کی گئی تھی اور اُس یونیفارم کا ماپ خدا کی کتاب میں لکھ دیا گیا تھا۔ جب تک قوم اس ماپ کے مطابق زندگی کا لباس بنواتی رہی، ان میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ جب انہوں نے اس ماپ کو چھوڑ دیا تو کسی نے ایرانی لباس پہن لیا، کسی نے تورانی۔ کسی نے ہندی رنگ اختیار کر لیا کسی نے افرنگی۔ نہ کوئی اپنا ذہنی لباس رہا نہ فکری رنگ ڈھنگ۔ یہی حالت آج تک چلی آ رہی ہے۔ ان میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے لئے وہی یونیفارم مقرر کر دی جائے۔

لیکن یونیفارم کا حکم تو محکمہ تعلیم سے جاری ہوتا ہے اور اسی کی اس قوم میں کمی ہے۔ اس لئے اس قوم کی بھیڑ چال کیسے ختم ہو۔ اسی بھیڑ چال کا نتیجہ ہے کہ یہاں ہر کام بلا سوچے سمجھے ہوتا ہے۔ یہی قوم کی تباہی کا موجب ہے۔

والسلام

* * *

جوابات والی کتاب

(عزیزہ زینت - نویں جماعت کی طالبہ)

میرے بزرگو! اور بھائیو! السلام علیکم

آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے سال، اسکولوں کی کتابوں کے چھپنے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اسی طرح، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے ہاں حساب کی کتاب اس طرح چھپ گئی کہ اس کے آخر میں جوابات والا حصہ غائب ہو گیا۔ اس سے عجیب ابتری پیدا ہوئی۔ جب لڑکیاں کوئی سوال نکالتیں، تو کسی کا جواب کچھ ہوتا کسی کا کچھ۔ ایک کا جواب دوسرے سے نہ ملتا۔ اور چونکہ کتاب میں جوابات کا حصہ موجود نہیں تھا۔ اس لئے ہر لڑکی اپنے اپنے جواب کو صحیح قرار دیتی۔ اتفاق سے ان دنوں ہماری استانی بیمار تھی۔ اس لئے لڑکیاں آپس میں خوب لڑتی جھگڑتیں۔ ہر ایک بحث کرتی کہ اس کا جواب صحیح ہے۔ دوسروں کا غلط ہے۔ جن چار لڑکیوں کا جواب، اتفاق سے ایک جیسا ہوتا، وہ ایک گروپ بن جاتیں اور دوسرے گروپ سے بحث شروع کر دیتیں۔ سارا وقت اس میں ضائع ہو جاتا۔ یہ جھگڑا اتنا طول کھینچتا کہ آپس میں بول چال تک بند ہو جاتی۔ بول چال بند ہوتی تو ایک دوسرے کے ساتھ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ ملنا جلنا بھی ترک ہو جاتا۔ غرضیکہ چند دنوں میں ہماری کلاس کی حالت عجیب ہو گئی۔ نہ وہ پہلا سا پیار محبت رہا۔ نہ ہنسی خوشی۔ سارا دن لڑکیاں منہ بسورے بیٹھی رہتیں۔ خدا خدا کر کے نئی کتابیں جن میں جوابات کا حصہ شامل تھا آ گئیں۔ اب نہ کسی قسم کی لڑائی نہ جھگڑا۔ ہر لڑکی جو سوال نکالتی، وہ جواب دیکھ کر اطمینان کر لیتی کہ اس نے سوال صحیح طور پر حل کیا ہے یا غلط۔ جس کا جواب غلط ہوتا، وہ کسی سے لڑے جھگڑے بغیر، دوبارہ سوال حل کرنے بیٹھ جاتی۔ جب سوال ٹھیک نکل آتا، تو اسے اطمینان ہو جاتا۔ دو چار دن میں وہ سارے لڑائی جھگڑے مٹ گئے۔ ہماری جماعت میں پھر پہلی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

مسلمان بھی ایک جماعت تھے جن کے سامنے صبح سے شام تک زندگی کے مختلف سوالات آتے تھے۔ ان سوالات کے جواب، خدا کی طرف سے ایک کتاب کے اندر موجود تھے جسے قرآن مجید کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے کوئی سوال آتا تو ان میں سے ہر ایک، اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُسے حل کرتا۔ پھر اپنا جواب اُس کتاب میں دیئے ہوئے جواب کے ساتھ ملا لیتا۔ اگر جواب اس کے ساتھ مل جاتا تو اسے اطمینان ہو جاتا۔ ورنہ وہ پھر سوال حل کرنے کی کوشش کرتا۔ جب تک اس کا جواب اُس کتاب کے ساتھ نہ مل جاتا کبھی اطمینان سے نہ بیٹھتا۔ جب اس طرح سب کے جواب

اُس کے ساتھ مل جاتے تو ایک کا جواب بھی دوسرے کے جواب کے ساتھ مل جاتا۔ اس طرح نہ ان میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا نہ جھگڑا۔ نہ بحث ہوتی نہ لڑائی۔ سب ہنسی خوشی، ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چڑھتے چلے جاتے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہوا کہ وہ جوابات والی کتاب کہیں رکھ کر بھول گئے۔ اب اُن کی حالت ہماری کلاس کی سی ہو گئی۔ اب ہر شخص اپنے اپنے جواب کو صحیح سمجھتا اور دوسرے کے جواب کو غلط۔ اس طرح ان میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ جن جن آدمیوں کا جواب ایک دوسرے سے مل جاتا، وہ ایک فرقہ بنا کر الگ ہو بیٹھتے۔ اس طرح ان کی جماعت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ ان میں سے ہر ایک فرقہ کا دعوےٰ تھا کہ اس کا جواب صحیح ہے دوسروں کا غلط۔ اس طرح اُن میں باہمی دشمنی پیدا ہو گئی۔ نہ وہ پہلی سی یگانگت رہی نہ دوستی۔ نہ محبت رہی نہ پیار۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ ان کی ساری قوتیں اپنے اپنے جواب کو صحیح اور دوسروں کے جواب کو غلط ثابت کرنے میں ضائع ہونے لگیں۔ اور چونکہ جوابات والی کتاب ان کے سامنے نہ تھی اس لئے نہ یہ آپس میں فیصلہ کر سکتے تھے کہ کس کا جواب صحیح ہے اور کس کا غلط۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا ان میں فیصلہ کر سکتا تھا۔

آج تک ان کی یہی حالت ہے۔ اِن کے اس باہمی لڑائی جھگڑے کا علاج کیا ہے؟ وہی علاج جو ہماری کلاس کے جھگڑے مٹانے کے لئے ہوا تھا۔ یعنی یہ جوابات والی کتاب کو اپنے سامنے رکھ لیں، اور ہر ایک اپنے اپنے جواب کو اس کے ساتھ ملا کر دیکھ لے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ دو دن میں سب جھگڑے مٹ جائیں گے اور پھر سے ساری جماعت ایک ہو جائے گی۔

کیوں میرے بزرگو! میں ٹھیک سمجھی ہوں ناں؟ والسلام

سلیم کے نام خطوط

جن میں ان تمام سوالات کا نہایت مدلل، اطمینان بخش اور بصیرت افروز جواب دیا گیا ہے جو ہمارے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انداز بیان نہایت شگفتہ اور دل نشین ہے یہ خطوط نہیں بلکہ اسلام کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ قیمت جلد اول آٹھ روپے۔ جلد دوم چھ روپے۔ جلد سوم چھ روپے۔

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

باب دوم
شعبۂ خواتین

دولت کی پیدا کردہ بیماریاں

(ڈاکٹر زاہدہ درّانی - ایم بی - بی - ایس - فاضلیہ کالونی - فیروز پور روڈ - لاہور)

صدر محترم! میرے بھائیو - بہنوں - اور بزرگو - السلام علیکم

غریبی اپنے ساتھ جو مصیبتیں لاتی ہے اس کا اندازہ ہر قلب حساس بآسانی کر سکتا ہے، لیکن ایک غلط معاشرہ میں دولت کی فراوانی جس قسم کی تباہیاں لاتی ہے، اس کا تصور عام طور پر نہیں کیا جا سکتا - ان تباہیوں کا ایک گوشہ وہ ہے جس کا اندازہ مجھے بہ حیثیت ایک لیڈی ڈاکٹر کے ہوا، اور انہی کی ایک خفیف سی جھلک میں اس وقت آپ کو دکھانا چاہتی ہوں - جہاں تک بیماری اور اس کے علاج کا تعلق ہے، غریبی کی پیدا کردہ مصیبت ایک ہی نوعیت کی ہوتی ہے مثلاً یہ کہ ایک غریب بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو لے کر آتی ہے جو ایک خطرناک اور مہلک بیماری کا شکار ہو گیا ہے - میں اُسے دوائی لکھ کر دیتی ہوں - یہ کوشش کیا کرتی ہوں کہ حتی الامکان دوائی سستی سے سستی ہو - وہ نسخہ ہاتھ میں لے کر پوچھتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ دوائی بازار سے کتنی قیمت میں ملے گی - میں کہتی ہوں کہ تین روپے میں مل جائے گی - "تین روپے" سن کر اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ - اس کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ اور اُس کی آنکھوں کی نمی، اُس کے دل کی ساری کہانی اُس کے ماتھے پر لکھ دیتی ہے - اور جب یہ دیکھ کر، میری آنکھیں بھی نم آلود ہو جاتی ہیں، تو اُس کے ضبط کئے ہوئے آنسو، ٹپ ٹپ گرنے لگ جاتے ہیں اور اُس کے بعد وہ دل کی ساری بات زبان پر لے آتی ہے -

لیکن دولت کی فراوانی ــــ یعنی ایک غلط معاشرہ میں دولت کی فراوانی ــــ جس قسم کے امراض پیدا کرتی ہے، ان کی نوعیتیں بھی بے شمار ہیں اور ان کی تہ تک پہنچنا بھی آسان نہیں ہوتا - مثلاً - بالکل نئے ماڈل کی ایک بڑی سی کار کلینک کے دروازے پر آ کر رکتی ہے - اور بڑے قیمتی لباس میں ملبوس ایک خاتون اس میں سے نکل کر اندر آ جاتی ہے - اس پر عجیب قسم کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہوتی ہے - آتے ہی کہتی ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ!

مجھے سخت تکلیف ہے۔ اس لئے پہلے مجھے دیکھ لیجئے۔ لیکن میرے مرض کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کے لئے آپ کو کافی وقت دینا ہوگا۔ اس کے بعد شکایات کی تفصیل کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب! صبح اٹھتی ہوں تو سارا جسم چور چور ہوتا ہے۔ آنکھ کھل جاتی ہے لیکن بستر سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ بصد مشکل اٹھتی ہوں تو چکر آجاتا ہے۔ پھر بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھے بلڈ پریشر ہے ناں! دو قدم چلتی ہوں تو دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ ملازم ناشتے کے لئے آوازوں پر آوازیں دیتا ہے لیکن مجھے کوئی طلب نہیں ہوتی۔ کل ایک انڈا کھا لیا تھا، سارا دن انتڑیوں میں درد رہا۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ میں زیادہ دن جی نہیں سکوں گی۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ پھر میری بچی کا کیا ہوگا۔ نہیں ڈاکٹر صاحب میں اپنی بچی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ کوئی اُسے مجھ سے چھین کر نہیں لیجا سکتا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب! بھوک بالکل نہیں لگتی۔ ہر وقت بخار رہتا ہے۔ چھ برس ہوگئے علاج کرتے، کہیں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فلاں ڈاکٹر کا علاج کیا۔ اور فلاں کا کیا۔ (اس کے بعد وہ شہر کے تمام بڑے بڑے ڈاکٹروں کے نام گنا دیں گی)۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مجھ سے کہتے تھے تمہیں کوئی بیماری ہی نہیں۔ پاگل کہیں کے! کوئی کہتا تھا آپ کے اعصاب کمزور ہیں۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب! بھلا میرے اعصاب بھی کہیں کمزور ہو سکتے ہیں؟ بس، ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک ہی تکلیف ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ آدھی رات تک جاگتی رہتی ہوں۔ اور سوچتی رہتی ہوں۔ معلوم نہیں کیا سوچتی رہتی ہوں۔ تنگ آجاتی ہوں تو خواب آور گولی کھا لیتی ہوں۔ بس یہ ایک دوائی ہے جو مجھے راس آئی ہے۔ اور کسی دوائی سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

میں معائنہ شروع کر دیتی ہوں، اور ہزار کہوں کہ ذرا خاموش رہیئے۔ لیکن وہ اپنی کہانی بدستور جاری رکھتی ہیں۔ معائنہ کے بعد میں دیکھتی ہوں کہ جتنی شکایتیں انہوں نے بتائی ہیں، ان میں سے انہیں کوئی شکایت نہیں۔ ذرا سی اعصابی کمزوری ہے۔ اس کے لئے میں دوائی تجویز کرتی ہوں تو سوال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب: یہ دوائی کتنے کی آئیگی؟

آپ کو یاد ہے کہ یہی سوال اس غریب بڑھیا نے بھی کیا تھا! میں کہتی ہوں کہ یہی کوئی دس بارہ روپے کی آجائے گی۔

دس بارہ روپے کی؟ ڈاکٹر صاحب! اس دوائی سے بھلا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں نے چالیس چالیس روپے فی شیشی والی دوائیاں بھی کھائی ہیں۔ آپ مہربانی کرکے، کوئی کام کی دوائی لکھ دیجئے۔۔۔ کام کی دوائی سے مراد ہوتی ہے، زیادہ سے زیادہ قیمتی دوائی۔

آپ انہیں کوئی دوائی لکھ دیجئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کھائیں گی۔ پھر یا تو کسی اور قیمتی دوائی کا مطالبہ کریں گی یا کسی اور ڈاکٹر کے پاس چلی جائیں گی۔ ان کے گھر جائیے تو الماریاں، ہسپتال دکھائی دیں گی۔ سب

دوائیوں سے بھری ہوئی - کسی شیشی میں سے دو گولیاں کھائی ہوئی - کسی میں سے چار - ان کی یہ کیفیت عمر بھر رہتی ہے - اگر ڈاکٹر کی نگاہ ذرا بھی سائیکلوجی پر ہے تو وہ دو چار نشستوں میں اندازہ لگا لے گا کہ مرض کا سرچشمہ کہاں ہے -

میں نے جو کچھ کہا ہے' برادران عزیز! وہ کسی خاص مریضہ کی کیفیت نہیں - وہ ہمارے اوپر کے طبقہ کا عمومی نقشہ ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ان میں ایسی خواتین بھی ہوتی ہیں جنہیں سچ مچ کوئی شکایت ہوتی ہے ، لیکن بیشتر ایسی ہوتی ہیں جنہیں طبیعی شکایت کوئی نہیں ہوتی - ان کا مرض نفسیاتی ہوتا ہے - اور پیدا کردہ ہوتا ہے - ہمارے علامہؒ کا - ان کا جسم بیمار نہیں ہوتا' دل بیمار ہوتا ہے - وہ دل نہیں جس کی دھڑکن (STE THESCOPE) سے سنی جاتی ہے ، بلکہ وہ دل جو انسانی خیالات کا سرچشمہ ہوتا ہے - اس دل کی بیماری میں ان کا اپنا قصور زیادہ نہیں ہوتا - جب ساری فضا نفسیاتی امراض پیدا کرنے والے جراثیم سے بھرپور ہو ، تو افراد کے لئے ان سے بچنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ان کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین نہیں ہوتا جن کھلونوں کو مقصود زندگی سمجھا جاتا ہے ان سے چند دنوں کے بعد طبیعت بھر جاتی ہے - اس کے بعد ان کی زندگی میں خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنے کے لئے یہ لوگ ہر طرف مارے مارے پھرتے ہیں ، لیکن چونکہ اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کونسی چیز کھو گئی ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں ، اس لئے وہ شے انہیں ملتی ہی نہیں جس سے ان کی زندگی کا خلا پُر ہو سکے - یہ ہے وہ ناکام جستجو جس سے یہ اس قسم کے نفسیاتی اوہام کا شکار ہو جاتے ہیں - اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں انسانی زندگی کا مقصد سمجھایا جائے اور ان کے سامنے وہ نصب العین حیات رکھ دیا جائے جس کے حصول کی کوشش میں انسانی قلب کو بھی راحت ملتی ہے - سائیکو تھراپی کے مشہور ماہر ، ڈاکٹر ینگ نے کہا تھا کہ

> میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ کیا ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس شے کو ضائع کر دیا تھا جو " زندہ مذہب " انسان کو مہیا کرتا ہے ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی شے دے دی جاتی جو اُن سے گم ہو چکی تھی - یہی ان کی دوا تھی -

یہ " شے " قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی - میں نے اس کا تجربہ کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو کر میرے سامنے آئی ہے کہ خدا کا یہ ابدی نسخہ کس طرح شِفَاءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ - یعنی دل کی بیماریوں کا علاج ہے - یہی وہ نسخہ ہے جس پر آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حجاز کے ہسپتال میں عمل کیا گیا تھا اور جس سے انسانیت کے سب روگ دور ہو گئے تھے - اسی نسخہ سے آج ہمارے معاشرہ کی بیماریوں کا بھی علاج ہو سکتا ہے -

والسلام

جنّت کی حُوریں

(محترمہ ثریا عندلیب۔ بیگم حبیب اللہ خان۔ لاہور)

صدرِ محترم۔ میری عزیز بہنو! اور بھائیو! السلام علیکم

میرے موضوع کا عنوان ہے۔ "جنت کی حوریں"

یوں تو طلوعِ اسلام کے پیش کردہ قرآنی حقائق سے فیضیاب ہوتے ہوئے بیس بائیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر چونکہ شروع کا دور اپنے لڑکپن کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت ذہن ناپختہ تھا اور عقل خام۔ کچھ پلے پڑا بہت سا نہیں پڑا۔ پڑھنے کے طور پر پڑھتے چلے گئے۔ مگر رفتہ رفتہ جوں جوں فہم و فراست میں سے اپنی سعی کے مطابق حصہ ملنے لگا۔ اس مطالعے سے اپنے ذہن کی تاریکیاں دُور ہونے لگیں اور قلب کے بند دروازے کھلتے چلے گئے۔ یوں جب قرآن کریم اپنی اصلی اور واضح شکل میں نگاہوں کے سامنے آیا تو اس کے نور سے دل و دماغ منور ہوگئے۔ اسلاف سے ملے ہوئے پرانے جامد اور کئی غلط عقیدوں کے خود تراشیدہ بتوں کی حقیقت کھلنے لگی۔ ایک ایک کرکے ان کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ اس ذہنی انقلاب سے سوچنے سمجھنے کی کیفیتیں ہی بدل گئیں۔ ہمارا دین اسلام کیا تھا؟ ہم نے اسے کیا بنا دیا! ہمیں کیسا ہونا چاہیئے تھا؟ ہم کیا بنے رہے! ان احساسات نے دل و دماغ کو جھنجوڑنا شروع کیا۔

ذہنِ انسانی کے اپنی خود ساختہ عقائد میں سے ایک عقیدہ "جنت کی حوروں" کا بھی تھا۔ بچپن سے ہی یہ خیال دل میں جاگزیں تھا کہ یوم الحساب کے بعد جب جنت میں جگہ پانے والے جنت میں داخل اور جہنم کی سزا پانے والے جہنم داخل ہو جائیں گے۔ تو جنتی مردوں کا استقبال وہاں کی "حوریں کریں گی" جنت کی وہ حوریں جو حسن و خوبصورتی کا مجسمہ ہوں گی۔ گویا مردوں کو اپنے اعمال کے صلے میں حوروں ایسی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ مگر ان کے مقابلے میں ہم بے چاری کم تر عورتیں آخر کہاں جائیں گی؟ ہمیں جنت میں کیا ملے گا؟ جنت بھی مل سکے گی یا نہیں؟ یہ تمام سوالات دماغ کی الجھن بنتے مگر ان کا صحیح جواب کہیں سے نہ ملتا جو تسکین و اطمینان بخش ہو سکتا۔ یوں ہی وقت گزرتا گیا۔

تا آنکہ قرآن حکیم کی طرف سچی رہنمائی کرنے والے مفکر اسلام جناب پرویز صاحب کی بصیرت قرآنی نے ہماری تمام الجھنوں کو دور کرنا شروع کیا۔ اور قرآن کے اسرار و رموز بغیر کسی پیچ و خم کے نہایت سادگی و صفائی سے ہم پر روشن ہونے لگے تو اس عقدہ کا یہ حیرت کا حل بھی سامنے آیا کہ اس زندگی کے بعد آیندہ ملنے والی زندگی میں مردوں کو قرآن پاک میں جن جنتی حوروں کی نوید دی گئی ہے ان سے مراد ہم یہی عورتیں ہی تو ہیں جو آج کی دنیا میں انہی مردوں کے ساتھ چلتی پھرتی اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ گویا ہم آج کی عورتیں کل کی حوریں ہوں گی۔

کس قدر روح پرور ہے یہ احساس کہ ہمیں جنت کی حور بننا ہے اور کیسا طمانیت بخش ہے یہ خیال کہ ہمیں ایسا مقام بلند ملنے والا ہے۔ اور کتنی شادابیوں و شادمانیوں کا حامل ہوگا وہ رتبہ جو ہمیں ہمارے پروردگار لایزال کی طرف سے مرحمت ہوگا۔ اس رب العالمین کی طرف سے یہ نعمت ارزانی ہوگی جس کا قانون مکافاتِ عمل عدل و انصاف کی حدوں سے سرمو تجاوز نہیں کرتا۔

اس موقع پر لازمًا یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر ہماری وہ کونسی خصوصیات ہوں گی جن کی بنا پر ہمیں جنت کی حور بننے کا استحقاق حاصل ہوگا۔ آیئے دیکھیں کتاب اللہ یعنی قرآن کریم اس کے متعلق کیسی وضاحتیں لئے ہوئے ہے۔ سب سے پہلی بات تو جنت و جہنم کا مفہوم سمجھ لینے کی ہے۔ جیسا کہ کئی دفعہ بذریعہ تحریر و تقریر پرویز صاحب قرآن کی بتائی ہوئی اس حقیقت کو بیان کر چکے ہیں، جو معاشرہ قوانین خداوندی کا پابند رہ کر اپنی زندگی کو آسودگیوں خوشحالیوں سے مالا مال کرے وہ جنتی معاشرہ کہلاتا ہے۔ اس کی یہ جنت اس دنیا سے شروع ہوتی ہے اور صاف شفاف جوئے رواں کی طرح آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یوں قیامت کے بعد ملنے والی جنت کا بھی وہی حقدار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ خدا کے عطا فرمودہ دین کو نہیں اپناتے اور اپنے خود ساختہ مذہب کے پیرو رہتے ہیں۔ ان کے اعمال کی کھیتیاں بالآخر جھلس جاتی ہیں۔ ان کی موجودہ زندگی بھی عذاب خداوندی سے بچ نہیں سکتی اور آگے چل کر بھی وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اس کے بعد جنت کی حوروں کے ذکر میں یہ دیکھنا ہے کہ خداوند کریم نے کن عورتوں کے لئے یہ عطیہ رکھا ہے۔ اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ مومن مردوں کے لئے مومن عورتیں۔ یہی مومن عورتیں جنت میں جائیں گی اور یہی مومن عورتیں جو اس دنیا میں، ایمان و عمل کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش چلتی ہیں، اخروی جنت میں حوریں بن جائیں گی۔ لیکن مومن عورتوں کی صفات کیا ہیں۔ اس سلسلے میں فرمان خداوندی ہوتا ہے لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ۔ یعنی شادی سے قبل ان کے متعلق یہ بات یقینی ہو کہ اپنوں یا بیگانوں میں سے انہیں کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ عفت و عصمت کی یہ وہ مستقل قدر ہے جو ہر مومن عورت کے لئے لازمی ہے اور جس کو اپنائے بغیر کوئی عورت مومن نہیں ہو سکتی۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شادی کے بعد

قرآن کریم انہیں وَ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کے فرش پر بیٹھنے والی بلند پایہ بیگمات۔ علم و عقل کے تحت ان کو یہ صفت دی گئی ہے کہ ایسی تعلیم و تربیت حاصل کریں گی کہ وہ قرآنی تمدن سے پہلے کی عورت سے بالکل جدا ایک نئی مخلوق بن جائیں گی۔ جیسا کہ فرمودۂ قرآن ہے۔ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا عام طور پر عورت جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے اور اپنے متنازعہ فیہ معاملے کو کھول کر بیان نہیں کر سکتی۔ بعض وقت غصے میں آجاتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ مگر جنتی حور بننے والی مومن عورت جو قرآنی تعلیم و تربیت حاصل کرتی ہے اس کا پیرہن ہی بدل جاتا ہے۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عُرُبًا اَتْرَابًا یعنی نہایت فصیح البیان ہو جاتی ہے۔ اور قرآنی تصورات میں مومن مردوں کی ہم آہنگ و یک رنگ۔ خیالات و تصورات و نظریات سب میں پوری پوری مطابقت رکھنے والی۔ سورۂ رحمٰن میں ان کو خَيْرَاتٌ حِسَانٌ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی تمام عمدہ صلاحیتوں اور اعلیٰ اوصاف کی حامل اور صحیح تناسب و توازن کی پیکر۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ۔ نگاہوں کو سمٹا کر رکھنے والیاں۔ جو کن انکھیوں سے ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ حیا کی مجسمہ۔ دوسری جگہ ہے۔ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ یعنی ان کی کم نگہی کی وجہ آنکھوں کا کوئی نقص نہ ہوگا۔ آنکھیں تو ان کی بڑی روشن اور خوبصورت ہوں گی۔ مگر وہ حیا کے پیش نظر اپنی نگاہوں کو دراز اور بیباک نہیں ہونے دیں گی۔ ان آیات سے مومن عورتوں کے لئے حیا کے احکام واضح ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ۔ بَيْضٌ روشن چیز کو کہتے ہیں اور بَيْضَةُ الْبَلَدِ۔ شہر کے محفوظ حصے میں رہنے والے شرفاء کو۔ اس اعتبار سے وہ خواتین شریف بیبیاں ہوں گی، نہایت روشن آنکھوں والی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایسی محفوظ کہ کسی غیر کا ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکے۔ محفوظ ہونے کی جہت سے قرآن نے باعصمت خواتین کو مُحْصَنٰتٌ کہا ہے قلعہ میں محفوظ۔ ایک دوسری آیت میں حُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حُوْرٌ عربی زبان میں جہاں صاف اور سفید رنگت کو کہتے ہیں۔ وہاں یہ لفظ خالص صاف ستھرے پاکباز انسان کے لئے بھی استعمل ہوتا ہے۔ اس سے اس کے معنی ایسی عقل کے بھی ہیں، جو فریب کار نہ ہو، چنانچہ وہ مومن عورتیں گوہر آبدار کی طرح پاک دامن و پاکباز ہوں گی۔ فہم و فراست والیاں۔ مگر ان کی عقل انہیں فریب کاریاں نہیں سکھائے گی۔ ایک بیش بہا موتی کی طرح جو نہایت محفوظ شکل میں رکھا ہو۔ یہی وہ حوریں ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ مَقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ہیں گھروں میں بادتار طریق پر رہنے والیاں جو جاہلیت کی عورت کی طرح اپنے حسن و زیبائش کی نمائش نہ کرتی پھریں۔ اسلام کی بیٹیوں کے یہی وہ خصائص ہیں جن کی وجہ سے قرآن انہیں جنت کی حوروں کا نام دیتا ہے اور یہی ہیں وہ جن کے ساتھ شادی کے سلسلے میں قرآن فرماتا ہے کہ اس سے وَاللّٰهُ يَدْعُوْا

اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ اللہ تمہیں اپنے قوانین کے ذریعے جنت کی زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جس میں تمہارے جوہرِ انسانیت کی حفاظت ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ سب خصوصیات ان مومن عورتوں کی ہیں جو اس دنیا میں جنتی معاشرہ متشکل کرتی ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں مومن مرد اور مومن عورتیں جنت میں جائیں گی۔ اس زندگی کی کنہ و حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ہم نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن میں اس کا بیان مثالی طور پر آیا ہے۔

اس باب میں یہ قرآن کے چند احکام ہیں جو آپ کے سامنے پیش کئے گئے۔ لیکن برعکس اس کے اپنی سوسائٹی پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو وہ بہیں جو بے باکیاں و بے حیائیاں نظر آتی ہیں وہ کسی سے چھپی ڈھکی نہیں۔ ذکر جنت کی حور کا ہے تو ظاہر ہے عورت کو ہی سامنے رکھنا پڑے گا۔ آج اسلام کی اس بیٹی کی حالت کیا ہے جو کل جنت کی حور بننے کے خواب دیکھ رہی ہے؟ کیا مومن عورت کی شان اسی میں ہے۔ کیا اس کا وقار اسی میں ہے کہ معاشرے کے سامنے وہ زیادہ سے زیادہ خود نمائی کرے اپنی آرائش و زیبائش کی نمائش کرے اور مردوں کے لئے محض ایک رنگین کھلونا بن جائے اپنی زندگی کا منتہیٰ یہی بنالے۔ جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ وہ اپنی زینت و آرائش کی چیزوں کی نمائش نہ کریں سوا ان کے جن کا کھلا رہنا ناگزیر ہو اور قرآن یہ بھی کہتا ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى۔ یعنی اپنے حسن و زیبائش کی یوں نمائش نہ کرتی پھرا کریں۔ یہ تو جاہلیت کے دور کی باتیں ہیں۔ وہ دور جو ماضی میں مدفون ہو چکا۔ ہم اپنی اس روش سے عقل و تہذیب کے اس دور میں جاہلیت کے اس دور کو واپس بلا رہے ہیں۔ کیا یہ ہمیں زیب دیتا ہے! یہ عریانیاں، یہ بے باکیاں مغرب کی عورتوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں آئیں اور روایتی بھیڑ چال رکھنے والی عورت نے اس تصنع و فریب کو اس حد تک اپنایا کہ مغرب کی عورت کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارے یہ اطوار، ہمارا یہ کردار ہمیں کبھی بھی مومن عورتوں کے زمرے میں شامل نہ ہونے دے گا۔ مومن عورت بننا تو ایک طرف رہا ہم نے تو عورت ہونے کا بھی شرف کھو دیا ہے۔

میری مسلمان بہنو! کیا یہ غور و فکر کا مقام نہیں۔ ذرا دیر رک کر ہمیں اپنے اوپر نگاہ تو ڈالنی چاہیئے ان تمام بداعمالیوں اور رسوائیوں کے باوجود جو ہمیں گمراہ ہونے کے سبب ملیں اب بھی ہم ڈوبنے سے بچ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس قرآن موجود ہے ہمیشہ تاباں و درخشاں رہنے والا نورِ خداوندی۔ تمام باطلوں کو مٹانے والا حق قرآن پاک۔ اس کی روشنی میں قدم بڑھائیے۔ یہی راستہ ہمیں جنت کی طرف لے جائے گا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

عورتوں کا مسئلہ

(پروفیسر زاہدہ منظور۔ لاہور کالج فار وومن)

محترمہ صدر صاحبہ — خواتین و حضرات!

(میرا موضوع ہے "عورتوں کا مسئلہ") اس گھسے پٹے مضمون کو پھر ایک بار تختۂ مشق بنانے پر معذرت چاہتی ہوں۔ پچھلے سال اسی موقعہ پر عورتوں کے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی تھی انھیں کے کچھ اور رُخ آج میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں یقین جانئے، خواتین و حضرات! عورتوں کے مسائل پر لکھنا اور کہنا میرا پسندیدہ مشغلہ نہیں۔ اپنی ہی مجبوریوں، لاچاریوں اور کمزوریوں کا ذکر بار بار کرتے ہوئے کچھ چھوٹے پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس ذکر سے ایک طرف تو بھری مجلس میں اعتراف کمتری ہوتا ہے اور دوسری طرف اپنی بے بسی اور بے کسی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر سوچتی ہوں ؎

گر تن نہیں زبان سہی۔ آزاد کچھ تو ہے

اور لکھنے بولنے پر آمادہ ہو جاتی ہوں۔

ممکن ہے برادران! آپ کو شکایت ہو کہ اب تک تو وطنِ عزیز کے سامنے کشمیر کا مسئلہ، بیم کا مسئلہ، زبان کا مسئلہ، اور روٹی کا مسئلہ تھا۔ اب ہم نے عورتوں کا مسئلہ ایک اور کھڑا کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر سنجیدگی سے اس پر غور کیجئے تو بیم کے مسئلے اور عورتوں کے مسئلے کی اہمیت میں بہت کم فرق نظر آئے گا۔ بیم برادران لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب کھیتوں کے بے آب و گیاہ ویرانوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اپاہج عورتوں کی آبادی بے جان بوجھ بن کر ملک کی رہی سہی توانائیوں کو چاٹتی چلی جاتی ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں، حاضرین! کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ زندگی کے لئے انسان کی جد وجہد زیادہ تھکا دینے والی ہو چکی ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اسے ہر روز نئی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر روز نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کے اس سیاسی اور معاشی پس منظر میں جس قوم کا آدھے سے زیادہ حصہ ذہنی طور پر تقریباً مفلوج ہو، اس کے لئے ترقی کے خواب دیکھنا تو ایک طرف محض زندہ رہنا ہی دشوار نظر آتا ہے۔ لاشوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی، بیزار زندگی آخر کتنے روز اور سسک سکتی ہے۔ عورتوں کا مسئلہ یہاں پھیل کر ملک و قوم کی بقا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

لیکن اور مسائل کی طرح اس مسئلہ کا حل بھی دو چار روز کی دوڑ دھوپ کی بات نہیں۔ عورتوں کو ایک بار پھر سطح انسانیت تک لانے کے لئے نہ صرف ان خارجی حد بندیوں کو گرانا ہوگا جو ان کے "محافظوں" نے ذاتی اغراض کی خاطر ان کے گرد کھڑی کر دیں ——— نہ صرف رسوم و روایات کے اس آہنی جال کو توڑنا ہوگا جس میں الجھائے جانے کے بعد عورت مکمل طور پر بے دست و پا ہو گئی۔ بلکہ خود عورت کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ان نقوش کو مٹانا ہوگا جو قرنوں کی محکومی و محرومی نے وہاں بنا رکھے ہیں۔ اس کی روح سے لپٹے ہوئے ان غلط تصورات کا گلا گھونٹنا ہوگا جو اس نے صدیوں سے اپنا رکھے ہیں۔ اسے اس احساس کمتری سے نجات دلانی ہوگی جو اب یقین میں بدل چکا ہے۔ ان حقوق سے از سر نو آشنا کرنا ہوگا جن کے پامال کئے جانے کا احساس تک اس میں مر چکا ہے۔ حلقہ زنجیر کو وہ کنگن سمجھ کر پہن چکی ہے۔ اس نے اپنی شکست سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اب اس گھر میں "آب گہر" کے سوا کچھ اور نہیں رہا۔ اور "آب گہر" سے مراد ہے اس کا سراپا نیاز ہو جانا۔

یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے جواب میں پچھلے سال کنونشن کے موقع پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ آج میں صرف اس گہری سازش کے المناک نتائج کا ایک رُخ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں۔

ہمارے ہاں سیتا اور رابعہ بصری کی روایات کو عورتوں کے لئے مقدس اور مثالی قرار دیا گیا ہے۔ ہند و پاکستان کی اکثر دیویوں نے ان روایات پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ملنے والوں میں سے ایک خاتون کے متعلق سنا جاتا تھا کہ وہ میاں کے گھر واپس آنے سے پہلے ایک عدد چھڑی اپنی تربیت کی خاطر کوٹنے میں کھڑی کر دیا کرتی تھیں تاکہ میاں کو جو دفتر سے تھک کر واپس آئیں گے، اس کی تلاش میں تکلیف نہ ہو۔ اور اکثر جب میاں اس چھڑی کے کرتب دکھاتے دکھاتے نڈھال ہو کر پلنگ پر گر پڑتے تو بیوی جلدی سے لڑکے کو دودھ لینے کے لئے بازار دوڑاتیں۔ آجتک بھی ان کی وفا شعاری یا نمک خواری کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی بہن چھڑنے کی غرض سے ان کے میاں کے بارے میں ایک آدھ گستاخانہ لفظ استعمال کرے تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔

خاندان بھر میں ان کی بہت عزت ہے۔ یہ ہے سراپا نیاز ہو جانے کا عملی مفہوم۔

خاندان کی ناک پروری کے سلسلے میں ہمارے ہاں ایک اور بیوی کی مثال بہت مقبول ہے۔ ان کے میاں اکثر بیکار

بیٹھتے تھے۔ اور اس بیکاری کے زمانہ میں انھیں سوائے بیوی کی "حفاظت" کے اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ چھت پر کیوں گئیں؟ آنگن میں کیوں بیٹھیں؟ فلاں کیوں آئی تھی؟ فلاں سے کیا بات کی تھی؟ کیوں کی تھی؟ اور اس سارے ڈرامے کا (Climax) روزانہ وہی زدوکوب ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد خاندان والوں کو غصہ آگیا اور انھوں نے فیصلہ کروا لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شریفوں میں طلاق کو فیصلہ کہا جاتا ہے۔ ان کے سسرال والے بہت پریشان تھے کہ دیکھیں گھر کی عزت رہتی ہے یا جاتی ہے۔ بزرگ جمع ہوئے۔ ان بیوی صاحبہ سے ان کی رائے دریافت کی گئی۔ انھوں نے چلمن کے پیچھے سے نہایت ڈرامائی انداز میں وہ مشہور فقرہ دہرادیا "اس گھر میں ڈولی آئی تھی، جنازہ جائے گا"۔ چاروں طرف بہت واہ واہ ہوئی۔ خاندان والے واپس آگئے۔ یہ رنجیدہ خاطر ضرور تھے لیکن اس رنج میں فخر کا عنصر بھی شامل تھا۔ ایسی ایسی بیٹیاں سب کے تھوڑا ہی ہوتی ہیں!!

ایک انگریز نقاد نے کہا ہے، حاضرین! کہ المیہ یا (Tragedy) وہ ہے جس میں کسی قیمتی متاع کے ضائع ہو جانے کا احساس ہو۔ اس لحاظ سے ان دیویوں کے قصے ہمارے ہاں کی عظیم ترین (Tragedies) ہیں۔ ان کی ہمت، ان کا استقلال، ان کی پاکیزگی، ان کی نیک دلی کا اس طرح چند غلط یا خود ساختہ روایات و اقدار کی بھینٹ چڑھ جانا المیہ نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن یہ المیہ دوسروں کے لئے ہے، ان دیویوں کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ میں نے کہا ہے المیہ کسی قیمتی متاع کے ضائع ہو جانے کے احساس کو کہتے ہیں۔ اور ان دیویوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ ان کی کونسی قیمتی متاع ضائع ہو گئی ہے؟ انھیں اگر اس کا احساس دلایا جائے تو انھیں الٹا غصہ آتا ہے! یہ ایک الگ المیہ ہے، اور پہلے المیہ سے بھی زیادہ شدید اور کرب انگیز المیہ!

ان قصوں کی جڑ، خواتین و حضرات! ان قدیم تصورات تک جا نکلتی ہے جن کی رو سے ظلم کا ہاتھ صرف "محبت" سے روکا جا سکتا ہے۔ اور انسانیت کی معراج یہی ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر چانٹا مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دیا جائے۔
لیکن ؎

یوں عرض و طلب سے کب اے دل پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خو ڈالو کب خوئے ستمگر جاتی ہے

دنیا میں برادرانِ عزیز! ہر جگہ ظلم و استبداد کی بنیاد طاقت پر ہے۔ خواہ یہ طاقت قانون کی ہو یا کلائی کی۔ اس کا مقابلہ بھی طاقت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ستیہ گرہ تو انسان اپنی بے بسی اور بے کسی سے مجبور ہو کر اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔ گاندھی جی کا جب اور کوئی بس نہ چلتا تھا تو وہ برت رکھنے پر آمادہ ہو جاتے۔ ان کی سیاسی اور مذہبی حیثیت کی وجہ سے ان کے برت کو تھوڑی بہت اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ چھوٹے ہوئے لوگوں کی عبرت کے لئے تو ماسٹر تارا سنگھ

کی ناکام کوشش ہی کافی ہے۔

ذکر ہو رہا تھا، حاضرین! عورتوں کی اس شکست خوردہ ذہنیت کا جو غلط عقائد اور روایات کی پیدا کی ہوئی ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ یہ نقش اس قدر گہرے ہو چکے ہیں کہ مٹتے مٹتے ہی مٹیں گے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ تعلیمی ادارے میں اس مشکل کا حل پوشیدہ ہے تو یہ خیال بھی خام ہے۔ تعلیمی ادارے ملک کے ماحول ہی کی پیداوار ہوا کرتے ہیں اور اس سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتے۔

انسان کے لئے خواتین و حضرات! اپنی اہمیت کا احساس ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کی خود اعتمادی کے لئے لازمی ہے کہ اس اہمیت کو سوسائٹی بھی قبول کرے۔ ہمارے ہاں تعلیم نسواں کا چرچا کافی ہو چکا ہے۔ لڑکیاں بڑے اہتمام سے بی اے اور ایم اے کر گئی ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ کو قوم کی خدمت کا بھی بہت خیال ہوتا ہے۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے دوسروں تک پہنچانا چاہتی ہے۔ لیکن اس مقام پر پہنچ کر اسے اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ سوسائٹی کے روایتی پیمانوں پر پورا نہیں اتر رہا۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے بذاتِ خود اس کی کوئی اہمیت سوسائٹی کی نگاہوں میں نہیں۔ بلکہ یہ سب کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس کے تخلیقی کاموں کے ساتھ بھی بہت ہی سرپرستانہ قسم کا سلوک کیا جاتا ہے اور خود اسے اپنی نظروں سے دیکھا جاتا ہے گویا وہ "نارمل" نہیں۔ وہ سہم کر ہتھیار ڈال دیتی ہے اور نارمل بن جاتی ہے۔ اور "بیگم فلاں" کی حیثیت سے دعوتیں کرنے اور کھانے لگتی ہے۔ سوسائٹی میں اسے بہت اہمیت ملتی ہے، اور کچھ عرصہ بعد وہ خود بھی اپنی اس اہمیت پر ایمان لے آتی ہے۔ حالانکہ اس اہمیت میں اس کی اپنی شخصیت یا صلاحیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی یہ اہمیت اضافی ہوتی ہے، ذاتی نہیں ہوتی۔

اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ذمہ داری کا خوف تعلیم یافتہ خواتین کو اپنے حقوق سے بے بہرہ رکھتا ہے۔ ایک امریکی مصنف نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ زندگی بھر انسان کی ساری جدوجہد کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے ——— کسی طرح ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا۔ صدیوں کی مغدوری نے ان خواتین کو ذہنی عافیت پسندی میں مبتلا کر دیا ہے۔ شخصی آزادی و خود مختاری کے حصول کے بعد وہ جانتی ہیں کہ اپنے متعلق انھیں ہر فیصلہ آپ کرنا ہوگا۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں حاضرین! کہ انسان کے ان فیصلوں کی ذمہ داری اسی دنیا کی زندگی تک محدود نہیں۔ موت کے بعد کی زندگی بھی انہی فیصلوں کے نتائج لئے ہوگی۔

اگر وہ کبھی سطحِ انسانیت کی ان ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار بھی ہو جاتی ہے تو خارجی حالات مانع آجاتے ہیں۔ پچھلے ہی دنوں بنیادی جمہوریتوں کے اجلاس کے موقعہ پر (Family Ordinance) کی شدید مخالفت

کی گئی۔ اور اراکین نے ان خواتین کی موجودگی میں جو اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے گئی تھیں کافی کم ظرفی کا ثبوت دیا۔ ان کی مخالفت کا انداز بڑا گھٹیا سا تھا۔ وجہ شاید یہ ہو کہ یہ خواتین انسانیت کے اس مظلوم گروہ کی نمائندہ بن کر گئی تھیں جس پر بنیادی جمہوریتوں کے بہت سے اراکین نے مدتوں مطلق العنان حکومت کی ہے۔ پھر بنیادی اقتدار کا ہاتھ سے نکل جانا تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں لیکن خدائی اختیارات یا (Divine rights) کو اتنی آسانی سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ "ترقی پسند" خواتین پر بہت لعن طعن ہوئی۔ اور کیوں نہ ہوتی ؎

گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

اس مخالفت کے لئے دلیل وہ صرف ایک ہی لائے تھے وہ یہ کہ علماء کا کہنا ہے کہ Family Ordinance اسلام کے خلاف ہے (۱۹۴۷ء میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بیویوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے حق کے کرکے بھاگ نکلنا شاید اسلام کے خلاف نہ تھا) بہر حال یہ مخالفت میرے نزدیک صرف عورتوں ہی کے لئے ایک مسئلہ نہیں بلکہ قوم کے لئے بھی ایک غور طلب مرحلہ ہو سکتی ہے۔ اگر ہر نئے قانون کی مخالفت کے جواز میں ہماری اسمبلیوں کے اراکین یہی ایک دلیل کو پیش کریں گے تو بہت جلد آئین کی صورت کچھ اور ہوگی۔

عائلی قوانین حاضرین! عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلوانے کے سلسلے میں ملک کا پہلا قدم ہے۔ اسے خود غرض طبقوں کی مخالفت سے بچانے کیلئے ہمیں ہر اس شریف ہاتھ کی ضرورت ہوگی جو انسانیت کی حفاظت کے لئے اٹھنا جانتا ہے اس کی حمایت کے لئے سب سے زیادہ ہمیں آپ کی قرآن فہمی پر بھروسہ ہوگا۔

لیکن کام یہیں پر ختم نہیں ہو جائیگا خواتین و حضرات! اس سے پہلے کہ ملک کے محکوم طبقوں کو ان کی آزادی واپس مل جائے اس سے پہلے کہ یہ مظلوم سطحِ انسانیت پر پھر ایک بار ابھر آئیں اور ان کی صلاحیتوں کو پنپنے کا موقعہ ملے ——— ہمیں معاشرے کی بہت سی اقدار کو بدلنا ہوگا۔ بہت سے پیمانوں کو گھٹانا اور بڑھانا ہوگا۔ بہت سی روایات کو بھلانا ہوگا۔ اس رومانی پرستی سے نجات حاصل کرنا ہوگی جو ماضی سے وابستہ ہر روایت اور ہر شخصیت کو تقدس کا رنگ دیدیتی ہے لیکن اس انکار کے ساتھ اقرار بھی ضروری ہے کیونکہ بے یقینی غلامی سے بھی زیادہ دہشتناک ہوا کرتی ہے۔ زندگی میں خلا کا احساس انسان کو یاسیت و ناآسودگی کی ان سرد تاریکیوں میں دھکیل دیتا ہے جہاں ہر حقیقت سائے میں ڈھل جاتی ہے۔ روس کا ترقی پسند مصنف گورکی کہتا ہے کہ تنقید اور انکار کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جو کسی خاص سچائی پر یقین رکھتا ہو۔

خواتین و حضرات! ہمارے پاس یہ سچائی قرآن ہے اور اسی کی روشنی میں ہم ان روایات و اقدار کو چھانٹ کر اپنے لئے الگ کریں گے جو زندگی کی توہین نہیں تکریم سکھاتی ہیں۔ شکریہ

حقائق و عبر

"الدّین یسر" کی عملی تفسیر

ہمارے ہاں انتخابات کے دوران میں اکثر ہوا یہ کرتا تھا کہ ایک ووٹر امیدوار سے اپنے ووٹ کا سودا کرتا تھا اور پولنگ کے موقع پر اپنے ووٹ کی پرچی کو صندوقچی میں ڈالنے کے بجائے اپنے ساتھ باہر لے آتا تھا اور اسے خریدار کے سپرد کر کے اس کے بدلے میں طے شدہ رقم وصول کر لیتا تھا۔

موجودہ حکومت نے جب نئے انتخابات کے سلسلے میں متعلقہ ضابطوں کی تدوین کی تو اس نوعیت کی بدعنوانی کے انسداد کے لئے یہ قانون وضع کیا کہ ووٹ کی پرچی کا موقع پر صندوقچی میں نہ ڈالنا قابل تعزیر جرم قرار پائے گا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ووٹر اپنا ووٹ آزادانہ ڈال سکے۔ امیدواروں نے اس کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ وہ ووٹرسے حلف لے لیں کہ وہ اپنا ووٹ انہی کے نام پر صندوقچی میں ڈالے گا۔ اگرچہ حلف کی خلاف ورزی کے واقعات بھی ہمارے ہاں ملتے ہیں لیکن بایں ہمہ ابھی تک بالعموم حلف کا احترام موجود ہے۔ اب ووٹروں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا کوئی ایسی تدبیر بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے حلف پر قائم نہ رہیں اور حلف توڑنے کے گناہ سے بھی بچ جائیں۔ وہ اس سلسلہ میں خاصے مضطرب و بے چین تھے کہ اتنے میں "بارگاہِ شریعت" کا دستِ تعاون آگے بڑھا اور اس نے ان سے کہا کہ گھبراتے کیوں ہو:

"خدا گر بہ حکمت بہ بندد درے
کشاید ز فضل و کرم دیگرے"

آؤ! تمہیں ہم بتائیں کہ اس مشکل سے نجات کی صورت کیا ہے۔ وہ حل کیا ہے اسے آپ معاصر کوہستان لاہور کی ۱۹؍ اپریل کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر سے معلوم کیجئے۔ اس میں لکھا ہے۔

لاہور ۱۸ اپریل (سٹاف رپورٹر) دارالافتاء مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی سے جاری کردہ ایک

فتویٰ میں ووٹ کی شرعی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ووٹ دینا شہادت دینا ہے۔ اس اعتبار سے غیر مستحق امیدوار کو ووٹ دینا جھوٹی گواہی دینا ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔ رسول کریمؐ نے جھوٹی گواہی کو شرک کے برابر قرار دیا ہے۔ دار الافتاء نے یہ فتویٰ بنیادی جمہوریتوں کے ایک رکن کے استفسار پر جاری کیا ہے۔ رکن بنیادی جمہوریت نے دریافت کیا تھا کہ ووٹوں کی خرید و فروخت کے لئے آجکل حلف کا طریقہ رائج ہے۔ کیونکہ ووٹ کی پرچی کا باہر لے جانا ممکن نہیں ہے اس لیے اب ووٹ فروخت کرنے والا خریدار کے سامنے حلف لیتا ہے کہ وہ اپنا ووٹ فلاں، امیدوار کے حق میں ڈالے گا۔ اس حلف کی حیثیت کیا ہے۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ حلف ناجائز ہے اور اس طرح کی قسم کھانے کے بعد کسی مستحق امیدوار کو ووٹ دینے کے لیے قسم توڑ دینا کارِ ثواب۔ لیکن قسم توڑ دینے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا تین دن روزہ رکھنا ہے۔ فتویٰ پر مولانا عبدالرشید نعمانی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا ولی حسن کے دستخط ہیں۔ فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ منتخب امیدوار کی شرعی حیثیت امور دینی کے وکیل کی ہے، اور اس کی غلطیوں کا گناہ ووٹر پر بھی ہوگا

کوہستان۔ ۱۹ اپریل ۱۹۶۲ء

غور فرمایا آپ نے کہ اس "قانون شریعت" کی رو سے وہ تمام پابندیاں کس طرح بیک جنبش قلم ختم ہو کر رہ گئیں جو سرکاری قانون کی رو سے ووٹوں کی خرید و فروخت پر عائد ہوتی تھیں۔ اور کس طرح ووٹروں کو "شرعاً" یہ آزادی حاصل ہو گئی کہ وہ جب چاہیں ایک امیدوار سے اپنا عہد توڑ دیں اور از سر نو دوسرے امیدوار سے عہد کر کے ووٹ کی مناسب قیمت وصول کریں اور پھر اس نئے عہد کو توڑ کر سودے بازی کی مارکیٹ میں جتنی بار چاہیں اپنے عہد کو توڑیں اور ووٹ کی نئی قیمت وصول کریں۔ اس سے پہلے ایک ووٹر اخلاقاً اس عہد کی وفا پر مجبور تھا جو اس نے برضا و رغبت کسی امیدوار سے کیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے اپنے اس عہد کو توڑا تو اسے اپنے خدا کے حضور اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس کے نزدیک ایسا کرنا بہت بڑی منافقت اور بد دیانتی کے مترادف تھا لیکن اب "شریعت حقہ" کے اس اعلان نے اس کے دل کے تمام خوف و خطرات ختم کر دیئے اب وہ اس عہد کو علی الاعلان توڑ کر "کارِ ثواب" کا مستحق بن سکتا ہے۔ بار بار اپنے حلف کو توڑ کر نیا سودا کر سکتا ہے۔ اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے اسے صرف دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا یا پھر تین دن کے روزے رکھنے ہوں گے۔

کیا اس کے بعد بھی آپ کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے کہ "شریعت کے قوانین" حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ خواہ مخواہ کی پابندیوں کا نام نہیں بلکہ پابندیاں توڑنے کی راہیں سکھانے کا دریچہ ہے۔

۲- فتویٰ پر دستخط کرنیوالے "علماء کرام"

ہمیں مشرقی پاکستان سے ایک کارڈ موصول ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ

> جناب پرویز صاحب! - آپ پر کفر کا جو فتویٰ دیا گیا ہے اس پر بندہ کا بھی دستخط ہے لیکن میں نے آپ کو صریح طور پر کافر کہنے سے احتیاط برتا بلکہ میں نے آپ کو گمراہ کہا۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کے تمام لٹریچر مطالعہ نہیں کیا۔ مختلف اخبارات مثلاً شہاب (لاہور) ایشیاء فاران ترجمان القرآن وغیرہ میں مختلف اوقات میں جو مضامین شائع ہوئیں ان کو دیکھ کر میں نے یہ رائے قائم کیا کہ آپ ضرور سلف صالحین کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور قرآن مجید کو من مان تاویل کا تختہ مشق بنانے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سنداً صحیح بھی ہے عجمی سازش قرار دے رہے ہیں.........

کارڈ کے نیچے انہوں نے اپنا پتہ حسب ذیل لکھا ہے۔

لطف الرحمان

TEACHER FULBARI MADRASSA

P.O. FULBARI. DIST. SYLHET.

E. PAK.

یعنی انہوں نے پرویز صاحب کے لٹریچر کا خود مطالعہ نہیں کیا بلکہ جو کچھ شہاب ایشیاء وغیرہ اخبارات و رسائل میں پرویز صاحب کے خلاف شائع ہوتا رہا اس کی بناء پر رائے قائم کر لی البتہ اتنا کرم ضرور کیا کہ انہیں کافر نہیں کہا گمراہ کہا۔ گویا ان کی مثال اس جج کی سی ہے جو محض استغاثہ (PROSECUTION) کے بیانات سنکر فیصلہ صادر کر دے۔ ڈیفنس کی بات سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔

لطف الرحمان صاحب! - آپ کا شکریہ کہ آپ نے کافر نہیں کہا۔ صرف گمراہ کہا ہے لیکن جن لوگوں نے کافر کہا ہے انہوں نے بھی پرویز صاحب کے لٹریچر کا خود مطالعہ نہیں کیا۔ آپ کی طرح مخالفین کی طرف سے پھیلائے ہوئے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ہی رائے قائم کر لی ہے۔ اگر آپ کو خدا توفیق دے تو پرویز صاحب کے لٹریچر کا خود مطالعہ کیجئے۔ آپ خدا

(باقی صفحہ ۶۲ پر دیکھئے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفتی محمد شفیع صاحب کے نام

خط و کتابت

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں، وہ خط و کتابت شائع ہو چکی ہے جو علماء حضرات کے مشغلۂ تکفیر کے ضمن میں پرویز صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب کے مابین ہوئی ہے۔ آخری خط (مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء) پرویز صاحب کی طرف سے تھا۔ مفتی صاحب کی طرف سے اس کا جواب موصول ہوا ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ جواب، پرویز صاحب کے خط کی روشنی ہی میں سمجھ میں آسکتا ہے اور قارئین کے لئے یہ ذرا دوبھر ہو گا کہ وہ اس خط کے لئے سابقہ پرچہ کی طرف رجوع کریں، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ پرویز صاحب کا خط بھی اسی مقام پر (دوبارہ) شائع کر دیں۔ سو پہلے پرویز صاحب کا خط ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے بعد مفتی صاحب کا۔ اور آخر میں پرویز صاحب کا تبصرہ۔ (طلوع اسلام)

پرویز صاحب کا خط

(مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء)

محترم مفتی صاحب — السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۲ء شرف صدور لایا۔ تکلیف فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں۔

۱۔ آپ نے فتویٰ کی تمہید میں لکھا تھا کہ

چند مستند علماء کی ایک جماعت نے پرویزی لٹریچر کو پورے غور سے دیکھا اور پوری احتیاط کے ساتھ
اس کے حسبِ ذیل اقتباسات لئے گئے ہیں۔ (پمفلٹ صفحہ ۱۹)

اب آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مستند اور معتمد علماء کی اس جماعت کی تحقیق ایسی قابلِ اعتماد اور ان کے پیش کردہ اقتباسات اس قدر مکمل تھے کہ انہیں دیکھ کر دیا تھا اس کی گنجائش نہ تھی کہ فتویٰ کی توثیق نہ کی جاتی۔ میں اس سلسلہ میں صرف ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ "مستند اور معتمد علماء" کی اس جماعت نے کس قسم کی تحقیق فرمائی۔ جو کچھ انہوں نے پیش کیا اس میں کس قدر دیانت سے کام لیا اور جن حضرات نے اس فتویٰ کی توثیق فرمائی انہوں نے کتنی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

۲۔ اس فتویٰ میں مجھے ذاتِ باری تعالیٰ کا منکر ٹھیرا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں حسبِ ذیل اقتباس پیش کیا گیا ہے۔

> اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے
> اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرتِ عالیہ کے قوانین کی اطاعت
> ہے (پمفلٹ صفحہ ۲۲)

اس اقتباس سے نتیجہ یہ قائم کی گئی ہے کہ میرے نزدیک

> اللہ تعالیٰ کا کوئی خارجی وجود نہیں (پمفلٹ صفحہ ۲۳)

اب دیکھئے کہ میرے لٹریچر میں ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کیا لکھا ہے۔ میں نے اس پچیس تیس برس کے عرصہ میں ذاتِ خداوندی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہزارہا صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ متفرق مضامین اور اشارات کے علاوہ میری ایک مستقل تصنیف صرف ذاتِ باری تعالیٰ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی جلد، اور میری اولین مستقل تصنیف ہے جو آج سے بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ پہلے ایڈیشن میں اس کا عنوان ہی "اللہ" تھا۔ جدید ایڈیشن میں اس کا نام "من ویزداں" رکھا گیا ہے۔ یہ بڑے سائز کے قریب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے ذاتِ خداوندی کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم پیش کی گئی ہے اور اس کے بعد صفاتِ خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) میں سے ایک ایک کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ دیکھئے کہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں ہی اس موضوع پر کیا لکھا ہے۔

> یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا
> انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود ذہن، لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا...... یہی وجہ

قرآن نے ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ اس کی صفات کیا ہیں۔ قرآنی تعلیم کی عظمت اور بے مثالیت کا بنیادی گوشہ یہ ہے کہ ان صفات کی رُو سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے بلند، پاکیزہ اور مکمل تصور اور کہیں نہیں مل سکتا۔

(من ویزدان صفحہ ۴ - ۵)

ذرا آگے چل کر لکھا ہے۔

اللہ کیا ہے؟ اس کی ہستی کیسی ہے؟ اس کی ذات کی کنہ و حقیقت کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے...... وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ خود کیا ہے وہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے۔ وہ شخص جو شیزی کی حقیقت تک پہنچنے سے عاجز ہے، شیزی بنانے والے کی کنہ و حقیقت کا کس طرح احاطہ کر سکتا ہے۔ ذاتِ خداوندی کی ماہیت کا علم انسان کی سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے۔

جس چیز کو انسان براہِ راست نہ سمجھ سکے اس کے متعلق اندازہ لگانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس جیسی کسی دوسری شے پر غور کیا جائے۔ لیکن وہ ذات بے مثل و بے نظیر ہے (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ) لہٰذا خدا کی ماہیت انسان کے ذہن میں کیسے آ سکتی ہے۔

(من ویزدان صفحہ ۴۴)

اسی کتاب کے صفحہ ۹۰ پر قرآن کریم کی آیات (۲/۲۵۵ ؛ ۵۹/۲۲-۲۴) کو درج کر کے، ان کے ترجمے ذاتِ خداوندی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ زندہ ہے۔ اور اس کی زندگی کے لئے فنا و زوال نہیں۔ القیوم ہے (یعنی ہر شے اس کے حکم سے قائم ہے اور وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں) نہ (اس کی آنکھ کے لئے) اونگھ ہے نہ (دماغ کے لئے) نیند۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ غیب و شہادت (حاضر و غائب) کا جاننے والا۔ رحمٰن و رحیم۔ تمام قوتوں کا مالک۔ ہر عیب سے پاکیزہ۔ سلامتی والا۔ امن دینے والا۔ نگہبان۔ غالب۔ بگڑی بنانے والا۔ بڑی عظمت والا۔ وہ لوگوں کے شرک سے پاک ہے اللہ وہ ہے جو پیدا کرنے والا۔ ٹھیک ٹھیک بنانے والا، صورت گر (بہترین ہیئت عطا کرنے والا) سب اچھے اچھے نام (تمام عمدہ صفات) اس کے لئے ہیں۔

اسی کتاب کے صفحہ ۴۰ پر آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

"اللہ حقیقی کی جو صفات گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آئی ہیں ان پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا رہ جاتا ہے جس کے لئے کسی اور "اللہ" کی تلاش رہے زندگی بخشنے والا، پرورش کرنے والا، رزق دینے والا، امن و سلامتی عطا فرمانے والا، ہر وقت نگہبان، بگڑی بنانے والا، ہر معاملہ میں کارساز، وہ جس پر کامل بھروسہ کیا جائے، جسے مایوسیوں میں پکارا جائے۔ جس کے قبضہ میں نفع و نقصان ہو۔ جو حاضر و غائب کا علم رکھتا ہو۔ سب پر غالب، عظمتوں کا مالک، ہر عیب سے منزّا۔ مالک الملک، شہنشاہ حقیقی، جس کی زندگی کے لئے فنا نہ ہو، جس کے سب محتاج ہوں۔ کیا اس ہستی کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی اس قابل ہے کہ اس کی عبودیت اختیار کی جائے۔

یہ کتاب کی ابتدا تھی۔ اس کے آخری صفحات میں آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، اللہ کی ذات کی معرفت انسانی حیطۂ ادراک سے ماورا ہے اس نے انسان کو اپنے متعلق جس قدر علم دینا چاہا وہ ان صفات کے ذریعے دے دیا جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اس لئے ہم اللہ کے متعلق جو کچھ بھی جان سکتے ہیں، وہ اتنا ہی ہے جتنا قرآن بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم خدا کی ذات کو پہچان سکیں یا اس کے متعلق علم حاصل کر سکیں۔ یہی ایک مومن کے لئے علم کا آخری نقطہ اور معرفت کی آخری حد ہے۔ اس سے آگے نہ بڑھا جا سکتا ہے نہ بڑھنے کی کوشش نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ اسلام ایک سیدھا سادا صاف و شفاف نصاب تعلیم و ضابطۂ عمل ہے۔ اس میں نہ بے مقصد فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں ہیں نہ بے مطلب عالم خیال کی قیاس آرائیاں۔ اسلام سے مفہوم یہ ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل شدہ قرآن کے مطابق خدا پر ایمان، فکر و نظر کے تمام گوشوں کا مرکز ہو۔ اور امکانی حدود کے اندر صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے جانا اعمالِ حیات کے تمام شعبوں کا محور۔ (صفحہ ۲۴۶)۔

۳۔ فتوی میں کہا گیا ہے کہ میں "موجود فی الخارج" خدا کا قائل نہیں ہوں۔ جو اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں وہ بھی اس الزام کی تردید کے لئے کم نہیں۔ لیکن اس خاص نقطہ کے متعلق میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے بھی آپ کی معلومات کے لئے درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں لکھا ہے۔

لیکن دین (قرآن) خدا کے متعلق ایک جداگانہ تصور عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا ذہنِ انسانی کا تراشیدہ نہیں بلکہ وہ خارج میں موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں تھا۔ اور اس وقت بھی موجود ہوگا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں ہوگا۔ وہ موجود ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی یہ خصوصیات (جنہیں صفات کہا جاتا ہے) مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہیں۔

(جلد دوم صفحہ ۷ ـــ ۸)

اور اسی خط کے آخر میں کہا گیا ہے

یہ ہے سلیم! وہ خدا جس پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پھر دہرا لو کہ یہ خدا کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ایک موجود فی الخارج ذات ہے جسے حقیقتِ مطلقہ کہا جاتا ہے۔ اس خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو اس نے خود وحی کے ذریعے بیان کر دی ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۶)

میں پوچھنا چاہتا ہوں "مستند اور معتمد علماء" کی اس جماعت سے جس نے میرے لٹریچر کو "پورے غور سے دیکھا اور پوری احتیاط کے ساتھ اس کے اقتباسات پیش کئے" کہ انہیں میرے لٹریچر میں مندرجہ بالا عبارات کہیں دکھائی نہیں دیں؟ (اور اگر دکھائی نہیں دیں تو کیوں؟)۔ اور میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں آپ حضرات سے جنہوں نے اس فتویٰ کی توثیق فرمائی کہ جس شخص کا عقیدہ وہ ہو جو مندرجہ بالا عبارات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے، کیا اس کے متعلق یہ کہا جاسکے گا کہ وہ موجود فی الخارج خدا کی ذات کا منکر ہے؟ اور جو لوگ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے اس کے متعلق یہ کہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا فتویٰ ہے؟

۴ــــ انسان کے لئے کیوں ضروری ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھے۔ اس سلسلہ میں میں نے (من جملہ دیگر امور) لکھا ہے کہ

انسان صرف جسم کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی اگر مناسب نشوونما ہو جائے تو اس میں حدِ بشریت کے اندر وہ صفات اجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں جنہیں خدا کے ضمن میں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی نشوونما یافتہ ذات حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے اور جسم کی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ (ان میں وہ صفات خداوندی شامل نہیں جن کا تعلق خدا کی لاتناہیت سے ہے) قرآن نے

صفاتِ خداوندی کو اس تفصیل اور وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ اسی لئے بیان کیا ہے کہ انسان انہیں اپنی ذات کی نشوونما کے لئے بطور معیار اپنے سامنے رکھے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ (قرآن کے الفاظ میں) "خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے"۔ یا اس کا قرب حاصل کرتا جاتا ہے۔

خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

(من و یزداں صفحہ ۷ - ۱۸ - ۲۴۷)

ان تصریحات کی روشنی میں اس فقرے کو دیکھئے جسے "علماء کی کمیٹی" نے پیش کر کے مجھے خدا کا منکر ٹھہرایا ہے۔ میں نے اسلامی مملکت کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اس نظریۂ حیات اور تصورِ مملکت کی بنیاد اس آفاقی اصول پر ہے کہ قانون سازی کا حق کسی انسان کو نہیں۔ انسانوں کے لئے اصولی قوانین اور اساسی آئین صرف ذاتِ خداوندی متعین کر سکتی ہے۔ اس لئے اس نظامِ مملکت میں حاکمیت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے، اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرتِ عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے، کسی غیر کی محکومیت نہیں۔ فلہٰذا اس مملکت میں انسان کسی غیر کا محکوم اور غلام نہیں ہوتا بلکہ یہ حریت و آزادی کا زندہ پیکر ہوتا ہے جو اس کی فطرتِ صحیحہ کا تقاضا ہے۔

(معراجِ انسانیت صفحہ ۴۲۰)

اس باریک نکتہ کی وضاحت "من و یزداں" میں ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے (مثلاً یہ کہ اُسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ نہ ہی وہ عدم سے وجود میں آیا ہے) انسانی ذات کی یہ صفات محدود اور سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں، نیز قابلِ نشوونما۔ ان کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ انسان صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے۔ جس چیز کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کہتے ہیں وہ (معاذ اللہ) کسی مستبد، مطلق العنان ڈکٹیٹر کے احکام کی فرماں پذیری نہیں ہوتی بلکہ ان ہدایات کا اتباع

ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان ہدایات کے اتباع سے اس کی ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔ (من و یزداں۔ صفحہ ۱۴)

علامہ اقبالؒ نے اسی بلند حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اسلام خدا کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے تخت و تاج کی اطاعت کا نہیں۔ اور چونکہ خدا زندگی کی آخری اساس ہے۔ اس لئے خدا کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی مثالی فطرت کی اطاعت کے مترادف ہے۔[1] (خطباتِ اقبال انگریزی صفحہ ۱۴۷)

۵۔۔۔ میں انہی اقتباسات کو کافی سمجھتا ہوں ورنہ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ذاتِ خداوندی کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہزاروں صفحات میں بکھرا پڑا ہے۔ آپ ان تشریحات سے بخوبی اندازہ فرما سکیں گے کہ علماء کی کمیٹی نے میرے لٹریچر سے اقتباسات پیش کرنے میں کس "احتیاط اور دیانت" سے کام لیا ہے اور جن حضرات نے اس فتوے کی توثیق فرمائی ہے، انہوں نے کس قدر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس ایک مثال سے آپ کمیٹی کی باقی تحقیق کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۶۔۔۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "اگر آپ کسی ایسے اقتباس کی نشاندہی کر دیں جو آپ کی جانب غلط منسوب کر دیا گیا ہے یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے...... یا کوئی ایسی شاذ عبارت ہو جو آپ کی کثیر التعداد تصانیف و مقالات میں پیش کردہ مسلک سے بالکل میل نہ کھاتی ہو۔ تو اس پر یقیناً غور کیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں اگر نفسِ فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضروری جائے گی"۔

میں نے اپنی تحریروں کے جو اقتباسات اس خط میں پیش کئے ہیں مجھے امید ہے کہ ان کی روشنی میں آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ آپ پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ آپ اس کا اعلان فرمائیں، اور اس اعلان کی عام اشاعت کریں کہ کم از کم اس حد تک علماء کی کمیٹی نے میرے خیالات پیش کرنے میں احتیاط اور دیانت سے کام نہیں لیا اور یہ کہ فتویٰ کی یہ شق باطل اور گمراہ کن ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو میں عندالضرورت اس کمیٹی کی تحقیقات کے باقی حصوں کی بھی اسی طرح نقاب کشائی کر دوں گا۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی آپ پر روشن ہو جائے گی کہ میرے معتقدات و نظریات کے خلاف (بقول آپ کے) "متعدد اہلِ علم عرصہ دراز سے وقتاً فوقتاً شرح و بسط کے ساتھ جو کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں" اس میں حقیقت کس قدر ہے اور خالص پروپیگنڈہ کس قدر۔

---

[1] خدا کرے کہ کوئی صاحب اقبالؒ پر بھی یہ کہہ کر کفر کا فتویٰ نہ لگا دیں کہ خدا زندگی کا خالق ہے، زندگی کی اساس نہیں۔ ویسے سنا ہے کہ فتویٰ ان پر بھی لگا تھا۔

۷۔۔۔ اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں یہ خط و کتابت اس لئے نہیں کر رہا کہ میرے نزدیک اس قسم کے فتووں سے واقعی ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے ایمان کا ثبوت پیش کرے۔ میں تو ایک طرف رہا، اس بات کے تو خود آپ بھی قائل نہیں کہ ان فتووں سے ایک مسلمان واقعی کافر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اپنی ہی مثال لیجئے۔ آپ دیوبندی مکتبِ خیال سے متعلق ہیں، اور آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دیوبندی حضرات پر کفر کے متعدد فتوی لگ چکے ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی اپنے آپ کو کافر نہیں سمجھا۔ یا جن علماء نے اس فتوے پر دستخط کئے ہیں وہ جن فرقوں سے متعلق ہیں، ان میں سے کون فرقہ ایسا ہے جس پر کفر کے فتوے نہیں لگ چکے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب مسلمان کے مسلمان ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ جب دوسروں کے فتووں سے یہ حضرات کافر نہیں ہو گئے، تو ان کے فتووں سے دوسرا کافر کس طرح ہو جائے گا؟ میں نے یہ خط و کتابت محض اس لئے کی ہے کہ آپ حضرات نے اپنی غیر ذمہ داری سے (جس کا ثبوت اوپر پیش کیا جا چکا ہے) ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو، دوسرے مسلمانوں سے بدظن کر دیا ہے اور اس قسم کی بدظنی قرآن کریم کی رُو سے اثم (گناہ) قرار پاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ سادہ لوح مسلمان اس گناہ سے بچ جائیں، اور آپ میں سے بھی جن حضرات کو اللہ توفیق عطا فرمائے وہ اپنے اس اقدام سے نادم ہو کر خدا کے حضور تائب ہو سکیں۔

۸۔۔۔ اگر آپ ایک مخلصانہ مشورہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں تو میں عرض کروں گا کہ اگر آپ فتاویٰ صادر کرنے کی اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں تو آپ کے لئے بہت اچھا ہوگا اس لئے کہ اس قسم کے فیصلے دینے کے لئے جس قسم کی تحقیق اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے وہ (معاف فرمایئے) آپ کے بس کی بات نہیں۔ اور دوسروں کی تحقیق جس قدر قابلِ اعتماد ہوتی ہے اس کا نمونہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے آپ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ عبادات کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال ناجائز ہے۔ اس فیصلہ تک پہنچنے کے لئے آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے اس کے متعلق الیگزینڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ "برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے۔ اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے"۔ اس "تحقیق" کی بنا پر آپ نے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اب اسی لاؤڈ سپیکر کو آپ سمیت تمام علمائے کرام بلا تامل استعمال کرتے ہیں۔

یہ تو عام مسائل کے متعلق فتویٰ کا ذکر ہے۔ جہاں تک کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کا تعلق ہے (وہ آپ کے الفاظ میں) "کوئی معمولی سانحہ نہیں ہوتا"۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کسی فرد کو اس کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں کہ وہ کسی مسلمان کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسے اپنا حق سمجھتا بھی ہے تو اس کے لئے میں

احتیاط اور دیانت کی ضرورت ہے وہ بالکل عیاں ہے۔ اور جب اس قسم کی تحقیق و کاوش آپ کے بس کی بات نہیں تو آپ کیوں اتنا بڑا بوجھ ناحق اپنی گردن پر لاد کر خدا کے حضور جائیں! میں سمجھتا ہوں کہ خدا یہ تو شاید پوچھ لے کہ تم نے کتنے کافروں کو مسلمان بنایا تھا لیکن وہ یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے کتنے مسلمانوں کو کافر بنایا تھا!

۹— اس تکفیر و تفسیق سے اُمت کو کس قدر نقصان پہنچا ہے، اسے تو چھوڑیئے۔ اس سے خود آپ حضرات کی پوزیشن کیا ہو گئی ہے اس کے متعلق آپ مجھ سے نہیں، خود اپنوں میں سے ہی ایک کی زبان سے سنیئے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

> افسوس ہے کہ مدتوں کی چلی ہوئی اس روش کو چھوڑنے پر ہمارے علمائے کرام کسی طرح راضی نہیں ہوتے انہوں نے اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول بنائے بیٹھے ہیں جن کو انہوں نے خود یا ان کے اسلاف نے اپنے مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو نصوص سے معانی اخذ کرنے میں ان کے گروہ نے اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کافر قرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کھینچ تان اور بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کی یہ کافرگری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علماء کی طرف سے بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جس کی نمائندگی یہ علماء کرتے ہیں۔ روز بروز علماء کا اقتدار مسلمانوں پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل مذہب کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے دور بھاگنے لگے ہیں۔ مذہبی مجلسوں اور مذہبی تحریروں کے متعلق یہ عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں فضول جھگڑوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس غلبۂ کفر و فسق کے زمانے میں عام مسلمانوں کو مذہبی علوم کی واقفیت بہم پہنچانے کا اگر کوئی ذریعہ ہو سکتا تھا تو وہ یہ تھا کہ علمائے دین پر لوگوں کو اعتماد ہوتا اور وہ ان تحریروں اور تقریروں سے فائدہ اٹھاتے۔ مگر افسوس کہ ان فرقہ بندی کی لڑائیوں اور ان تکفیر کے مشغلوں سے یہ ایک ذریعہ بھی ختم ہوا جا رہا ہے اور یہ مسلمانوں میں مذہب سے عام ناواقفیت اور گمراہی کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ کاش ہمارے علماء اپنی اس غلطی کو محسوس کریں اور اسلام اور مسلمانوں پر نہیں تو خود اپنے اوپر ہی رحم کر کے اس روش سے باز آ جائیں جس نے ان کو اپنی قوم میں اس قدر رسوا کر دیا ہے۔ درانحالیکہ یہی وہ قوم تھی جو

کبھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم صفحہ ۱۵۲)

۱۰۔ میں حسب سابق اس خط و کتابت کو بھی اشاعت کے لئے پریس میں بھیج رہا ہوں۔ اللہ ہم سب کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

خیر طلب:۔ پرویز ۲۵ مارچ۔ ۱۹۶۳ء

مفتی محمد شفیع صاحب کا

جواب

جناب[1] پرویز صاحب السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

بجواب مراسلہ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء عرض ہے کہ میں نے اپنے سابقہ مکتوب مورخہ ۱۳ مارچ میں گذارش کی تھی کہ اگر آپ کسی ایسی عبارت کی نشاندہی کریں جو آپ کی جانب غلط منسوب کی گئی ہے یا کوئی اقتباس پیش کریں جو ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے۔ اگر ایسی کوئی صورت ہے تو یقیناً اس پر غور کیا جائے گا، اور اس کے نتیجہ میں اگر نفس فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضرور کی جائے گی۔

آپ اس قسم کی کوئی عبارت یا کوئی ایسا اقتباس پیش نہیں کر سکے، اس صورت میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ آپ کھلے دل سے اس بہتان پر معذرت کرتے جو آپ نے علماء پر لگایا ہے کہ

"میری تحریروں میں سے ایک ایک آدھ آدھ فقرہ۔ اِدھر اُدھر سے اخذ کر لیا گیا ہے، اور انہیں مکمل اقتباسات کہہ کر پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر ان منتشر ٹکڑوں سے جو مفہوم مرتب کیا گیا ہے وہ بیحد غلط اور گمراہ کن ہے۔"

بجائے اس کے آپ نے پھر غلط بحث کی سعی لاحاصل شروع کر دی، اور ایک طویل مراسلہ لکھا، جس کا زیادہ سے زیادہ حاصل یہ ہے کہ آپ نے اپنی ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تصانیف میں متعدد جگہ "ذات باری تعالیٰ" کے متعلق صحیح تصور

---

[1] خط کے شروع میں "بسم اللہ" کاتب کا سہو نہیں۔ اصل خط پر بسم اللہ "یا ۷۸۶" ہے ہی نہیں۔ (طلوع اسلام)

بھی پیش کیا ہے، معلوم نہیں اس کی ضرورت آپ کو کیوں لاحق ہوئی۔ اس لئے کہ علماء نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ساری عمر میں آپ نے اپنی تحریروں میں کوئی بات یا کوئی عبارت صحیح لکھی ہی نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر سو جگہ ایک شخص بالکل صحیح بات کہے اور دس بیس جگہ بالکل غلط اور کافرانہ عقائد کا اظہار کرے تو کیا محض یہ امر کہ اس نے متعدد بار صحیح بات بھی کہی تھی اس کو غلط تصورات رکھنے یا شائع کرنے کی ذمہ داری سے بری قرار دیدے گا؟ آخر مرزا غلام احمد آبجہانی نے بھی تو متعدد جگہ اپنے آپ کو غیر نبی ہی قرار دیا ہے صرف چند ہی مقامات ایسے ہیں جہاں اس نے نبوت کا دعویٰ پیش کیا ہے

اللہ پاک کے متعلق ملت اسلامیہ کے مسلمہ عقیدے کو لیجئے اور پھر محض نمونے کے طور پر اپنی ان چند عبارتوں ہی کو دیکھ لیجئے جو اس "فتویٰ" میں درج ہیں، کہیں:۔

اللہ رسول سے مراد مرکز ملت ہے (معارف القرآن جلد ۴ صفحہ ۶۲۵، ۶۲۶)

اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکز ملت ہے (معارف القرآن جلد ۴ صفحہ ۶۸۶)

"خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے (معارف جلد ۴ صفحہ ۴۲)

اللہ و رسول سے مراد وہ مرکز نظام دین ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں (معارف جلد ۴ صفحہ ۶۱۶)

قرآن کریم میں جہاں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے (معارف جلد ۴ صفحہ ۶۲۴، ۶۲۳)

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مسلمانوں کا امام ہے (معارف جلد ۴ صفحہ ۶۲۴)

قرآن کریم میں مرکز ملت کو اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ اور رسول یعنی مرکز نظام ملت کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے (معارف جلد ۴ صفحہ ۶۳۱)

اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد مرکزی حکومت کی اطاعت ہے جو قرآنی احکام کو نافذ کرے گی (اسلامی نظام صفحہ ۸۷)

اب ذرا ہٹ دھرمی اور سخن پروری کے جذبہ سے ہٹ کر غور کیجئے کہ آیا ذات باری کا یہی وہ مفہوم ہے جو سلف سے لے کر خلف تک امت محمدیہ کا بنیادی عقیدہ رہا ہے۔

پھر اللہ پاک کے بارے میں اس طرح کے تصورات آپ کی تصانیف میں شاذ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے بلکہ جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اور آپ کے عقائد کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔

آپ کا یہ کہنا کہ بیس پچیس سال پہلے کی تصانیف میں آپ نے "ذات باری تعالیٰ" کے متعلق فلاں بات لکھی اور پھر فلاں مقالے میں فلاں تصور پیش کیا تو اسی ایک موضوع کا کیا سوال ہے، دوسرے بنیادی مسائل مثلاً حجیت حدیث، سنت رسول اور اطاعت رسول وغیرہ کے متعلق بھی ابتداء آپ نے جو خیالات پیش کئے ہیں

وہ چنداں قابلِ اعتراض نہ تھے، بخوفِ طوالت آپ کی سابقہ تحریروں کے اقتباس پیش کرنے سے اجتناب کرنا چاہتا ہوں، ورنہ کتنی ہی عبارتیں بتائی جا سکتی ہیں جن میں باہم تضاد و تہافت نمایاں ہے، بہت سے مسائل کے متعلق ابتداءً آپ نے کچھ مسلک پیش کیا اور پھر بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جہاں اب آپ پہنچے ہیں کہ سنتِ رسول کے سرمایہ کو عجمی سازش کہنے لگے، اسے استخفاف و استہزار کا ہدف بنانے لگے اور زیادہ سے زیادہ اسے تاریخ کا درجہ دیکر ناقابلِ اطاعت قرار دے دیا۔

اس مراسلہ کے اختتام سے پہلے آپ کی توجہ آپ ہی کی ایک عبارت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ "کافر گری" کی جو پھبتی آپ نے چست کرنے کی کوشش کی ہے اس کے متعلق آپ اپنا موقف بھی نظر میں رکھیں۔ آپ ہی کی تحریر ہے کہ:۔

> تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہوتا رہا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے زمانہ کے مذہب میں تبدیل کر دیا جائے، چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور آج جو اسلام دنیا میں مروج ہے وہ، زمانہ قبل از قرآن کا مذہب ہو تو ہو، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں" (سلیم کے نام صفحہ ۲۵۲)

اس میں آپ نے تیرہ سو سال کی پوری امتِ محمدیہ کے اربوں مسلمانوں کو جن میں صلحاء، اولیاء، اور اتقیا بھی لاکھوں کی تعداد میں شامل ہیں، یک قلم اسلام سے خارج، قرآنی دین سے بے تعلق اور جاہلیت کے مذہب کا پیرو قرار دیدیا ہے اس وقت آپ کو اپنے الفاظ میں یہ خیال نہ آیا کہ:۔

> "خدا شاید یہ تو پوچھے گا کہ تم نے کتنے کافروں کو مسلمان بنایا تھا۔ لیکن یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے کتنے مسلمانوں کو کافر بنایا تھا۔

ایک فرد پرویز صاحب" کی تکفیر و تفسیق سے تو آپ کے نزدیک امت میں زلزلہ آگیا اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ گیا مگر پوری امت کی تکفیر و تفسیق سے اسلام اور امتِ اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

میں نے اپنے پہلے خط میں بھی لکھا تھا کہ لاطائل بحث و جدال کی نہ مجھے فرصت ہے نہ اس کا کوئی فائدہ نظر آتا ہے اب آپ کے مکتوب کے فقرہ ۷ میں جو لب و لہجہ استعمال کیا گیا ہے، جس سطح پر آکر آپ نے گفتگو شروع کی ہے اور جو زبان بولنا اختیار کیا ہے، اس کے پیشِ نظر اس رجحان کو مزید تقویت ہوئی کہ اس جواب کو اپنی جانب سے آخری جواب تصور کروں اور آپ سے درخواست کروں کہ مجھ سے مزید مراسلت کی زحمت نہ کریں نہ مجھے آئندہ کسی مراسلت کے

جواب کی توقع کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت کی راہ دکھائیں۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۲ راپریل ۱۹۶۲ء

پرویز صاحب کا تبصرہ

چونکہ مفتی صاحب نے کہہ دیا ہے کہ انہیں مزید خط نہ لکھا جائے، اس لئے میں نے انہیں، ان کے خط کا جواب نہیں بھیجا۔ لیکن چونکہ انہوں نے اپنے خط کو اخبارات میں شائع کرا دیا ہے (اور اس کا طلوعِ اسلام میں شائع ہونا ویسے بھی ضروری تھا) اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کے خط کے ساتھ چند وضاحتی سطور شائع کر دی جائیں۔ اس مقام پر میں اس حقیقت کو (جس کی طرف میں نے اپنے خط، مورخہ ۲/۳/۶۲ کے پیراگراف میں اشارہ کیا تھا) ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں یہ خط و کتابت ۔ یا وضاحت ۔ اس لئے ضروری نہیں سمجھتا کہ میرے نزدیک ان حضرات کے اس فتوے کو کوئی اہمیت حاصل ہے (ان کے اس قسم کے فتاویٰ کی حیثیت و حقیقت کے متعلق، اسی خط کے اخیر میں چند الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں)۔

میں یہ وضاحت اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے وہ سادہ لوح مسلمان جنہیں ان حضرات نے اپنی بہتان تراشیوں اور افتراء پردازیوں سے بدراہ کرنا شروع کر رکھا ہے، میری اس وضاحت سے حقیقتِ حال تک پہنچ جائیں اور بدظنی کے گناہ سے بچ جائیں۔ باقی رہے خود یہ حضرات، سو آپ مفتی صاحب کے خط سے خود اندازہ لگا لیں گے کہ انہیں یہ توفیق ہی نصیب نہیں ہوئی کہ: حقیقت کے بے نقابانہ سامنے آجانے کے بعد بھی، اس کا اعتراف کر لیں۔ یہی وہ ذہنیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ (۲۷/۱۴)۔ ان کا دل تو یقین کر لیتا ہے لیکن سرکشی اور اپنی بڑائی کا خیال انہیں اس کے

اعتراف کی طرف آنے نہیں دیتا۔ بلند مسندیں اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ پندارِ نفس، اعترافِ حقیقت کی راہ میں بُری طرح حائل ہوتا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ

در مجلسِ ما زاہد، زنہار تکلف نیست
البتہ تو می گنجی۔ عمامہ نمی گنجد

(۲) مفتی صاحب چھوٹتے ہی فرماتے ہیں کہ

آپ اس قسم کی کوئی عبارت یا کوئی ایسا اقتباس پیش نہیں کر سکے۔

آپ میرے سابقہ خط (صفحہ ۲۵ تا ۲۵) کو دیکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اس میں میں نے کوئی عبارت یا اقتباس پیش کیا ہے یا نہیں؟ وہ تو سارے کا سارا اقتباسات پر مشتمل ہے! آپ یقیناً دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ حضرات اس قدر صریح غلط بیانی کی جرأت کس طرح کر لیتے ہیں؟ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ ان کی ٹیکنیک کیا ہے؟ مفتی صاحب اپنے خطوط کو اپنے ہم نوا اخبارات میں شائع کرا دیتے ہیں لیکن میرا جواب شائع نہیں کراتے۔ اب آپ دیکھئے کہ جب ان کے ہم نواؤں کا حلقہ صرف انہی کے خطوط کو پڑھے گا اور میرا جواب ان کے سامنے نہیں ہوگا، تو پوزیشن کیا پیدا ہوگی؟ مثلاً انہوں نے اپنے پہلے خط میں لکھا کہ

اگر آپ کسی ایسے اقتباس کی نشاندہی کریں جو آپ کی جانب غلط منسوب کیا گیا ہو۔ یا آپ کا اقتباس ایسا ادھورا ہے کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے..... یا آپ کی کوئی ایسی شاذ عبارت ہو جو آپ کی کثیر التعداد تصانیف و مقالات میں پیش کردہ مسلک سے بالکل میل نہ کھاتی ہو..... تو اس پر یقیناً غور کیا جائے گا۔

اس کے بعد وہ میرا جواب تو شائع نہیں کراتے لیکن اخبارات میں اپنا یہ خط شائع کرا دیتے ہیں کہ

آپ اس قسم کی کوئی عبارت یا اقتباس پیش نہیں کر سکے۔

جن لوگوں کے سامنے صرف مفتی صاحب کے خطوط ہوں، اور ان کی درمیانی کڑی (میرا خط) نہ ہو، وہ جس نتیجہ تک پہنچیں گے وہ ظاہر ہے! یہی ان کی ٹیکنیک ہے۔ یعنی اپنے حلقہ کے سامنے حقیقت کو آنے ہی نہ دو۔ انہیں تاریکیوں کے پردوں میں رکھو تاکہ وہ دوسرے کی بات سننے ہی نہ پائیں۔ ان سے کہدو کہ وہ طلوع اسلام کبھی نہ پڑھیں کیونکہ اس سے ان کا ایمان خراب ہو جائے گا۔ اور اگر اس کے باوجود ان میں سے کوئی کسی طرح حقیقت سے باخبر ہو جائے تو اسے "شریعت" کا یہ مسئلہ سمجھا دو کہ

عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں

اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے

(سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء)

اور اگر وہ اس پر بھی "سرکشی" سے باز نہ آئے، تو اس پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگا کر اسے مکتب سے باہر نکال دو۔

سودا بدماغش زد، از مدرسہ بیروں بہ

(۳) اس ٹیکنیک کے بعد، مفتی صاحب محترم اس حربے کو لے کر آگے بڑھے ہیں جسے قرآن "یوسوس فی صدور الناس" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنا۔ فرماتے ہیں۔

اگر سو جگہ ایک شخص بالکل صحیح بات کہے اور دس بیس جگہ بالکل غلط اور کافرانہ عقائد کا اظہار کرے تو کیا محض یہ امر کہ اس نے متعدد بار صحیح بات بھی کہی تھی اس کو غلط تصورات رکھنے یا شائع کرنے کی ذمہ داری سے بری قرار دے گا؟ آخر مرزا غلام احمد آنجہانی نے بھی تو متعدد جگہ اپنے آپ کو غیر نبی قرار دیا ہے۔ صرف چند ہی مقامات ایسے ہیں جہاں اس نے نبوت کا دعویٰ پیش کیا ہے۔

میں نے اپنے جواب کو فتویٰ کی صرف اس ایک شق تک محدود رکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ

میں خدا کے خارجی وجود سے منکر ہوں۔

اس کے متعلق میں نے، اپنے سابقہ خط میں، متعدد اقتباسات پیش کئے تھے۔ اب مفتی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ اقتباسات تو ٹھیک ہیں، لیکن دیگر مقامات پر تم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم خدا کے خارجی وجود کا منکر ہو۔

میں مفتی صاحب کو۔ علمائے کرام کی اس جماعت کو جس نے میرے تمام لٹریچر کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے ساتھ ان ایک ہزار علماء کو جنہوں نے اس فتویٰ پر دستخط کئے ہیں، چیلنج دیتا ہوں کہ وہ سب اکٹھے ہو جائیں وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۳/۲)۔ اور

میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے اس میں ایک مقام بھی ایسا دکھا دیں جس میں میں نے خدا کے خارجی وجود کا انکار کیا ہو۔

اگر آپ سچے ہیں اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ تو اس چیلنج کو قبول کیجئے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲۴/۲)۔ اگر آپ ایسا نہ کر سکے ---- اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے۔ تو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے ڈریئے۔ اس قسم کی باتوں سے آپ

اپنے آپ کو فریب دے سکتے ہیں اور اپنے ہم نواؤں کو بھی دھوکے میں رکھ سکتے ہیں، لیکن خدا کے قانون مکافاتِ عمل سے بچ کر کہاں جاسکتے ہیں ـــ اے کاش! ان حضرات کا اُس کے اس اٹل قانون پر یقین ہوتا۔ پھر یہ اس قسم کے حربوں سے کبھی کام نہ لیتے!

مفتی صاحب نے اپنے خط میں میرے اس فقرہ کو پھر دہرا دیا ہے کہ

خدا عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے۔

یہی وہ فقرہ ہے جس سے وہ ریز عم خویش، ثابت کرتے ہیں کہ میں (معاذ اللہ) خدا کی ذات کا منکر ہوں۔ اس سلسلہ میں میں اپنے سابقہ خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ جو شخص صفاتِ خداوندی کا قائل ہے وہ ذاتِ خداوندی کا منکر کیسے ہو سکتا ہے؟ صفات تو ہوتی ہی ذات کی ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ذاتِ خداوندی کا قائل ہو لیکن اس کی صفات میں سے کسی ایک (یا بعض) صفات کا قائل نہ ہو (اگرچہ قرآن پر ایمان رکھنے والے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ان تمام صفات کو بھی مانے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے)۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص خدا کی کسی ایک صفت کا بھی قائل ہو اور اس کی ذات کو نہ مانے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ تو مانے کہ زید سخی ہے۔ بہادر ہے۔ نیک دل ہے (وغیرہ وغیرہ) لیکن خود زید کے وجود سے انکار کر دے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ ذات کے بغیر صفات کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔

ان حضرات کے فہم و بصیرت کا تو یہ عالم ہے، اور دعوے اتنے بڑے بڑے ہیں!

(۴) اس کے بعد مفتی صاحب نے 'فتویٰ' کے وہ فقرے نقل کر دیئے ہیں جن میں میں نے کہا ہے کہ "خدا و رسول" کی اطاعت کا عملی مفہوم، اس اسلامی نظام کی اطاعت ہے جو دین کی اقامت کے لئے وجود میں آئے اس سلسلہ میں میں نے اپنے سب سے پہلے خط (مورخہ ۲۴؍۲؍۶۰ مطبوعہ طلوع اسلام بابت اپریل ۶۲ء صفحہ ۲۱) میں (جسے مفتی صاحب کے ہم نوا اخبارات نے شائع نہیں کیا) لکھا تھا۔

(ب) اطاعتِ خدا اور رسول کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت یہ نہیں تھی کہ ہر شخص اپنے اپنے مفہوم کے مطابق خدا اور رسول کی اطاعت کر لیتا تھا۔ اس کی صحیح شکل یہ تھی کہ حضورؐ کے بعد جو خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہوئی تھی اس سے پوچھا جاتا تھا کہ فلاں معاملہ میں خدا اور رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے گی۔ جو فیصلہ وہاں سے ملتا اسے خدا اور رسول کی اطاعت سمجھا جاتا۔ اسی سے وحدتِ اُمت قائم تھی۔ جب خلافت باقی نہ رہی تو خدا اور رسول کی اطاعت انفرادی

طور پر ہونے لگی۔ اس سے امت میں افتراق پیدا ہوا۔ اُمت میں دوبارہ وحدت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے۔ اور اُس کے فیصلوں کے مطابق خدا اور رسول کی اطاعت کی جائے۔ اسی خلافت کو بغرضِ اختصار، مرکزِ ملت یا اسلامی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور میں اس کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں میں نہ ہر نظامِ حکومت کو اسلامی نظام کہتا ہوں اور نہ اس کے فیصلوں کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت۔ میرے نزدیک خلافت علیٰ منہاج نبوت کے علاوہ کوئی نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا اور نہ اسے مرکزِ ملت قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتاب "اسلامی نظام" میں (جس کے صفحہ ۱۰۶ سے مفتی صاحب نے ایک فقرہ نقل فرمایا ہے) آپ کو یہ عبارت ملیگی۔

قرآن کریم کی ان نصوص صریحہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ "اللہ اور رسول" کی اطاعت سے مراد مرکزِ حکومتِ قرآن کی اطاعت ہے۔ وہ مرکز جو خدا کے احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول اللہؐ کی امامتِ کبریٰ کو آگے چلانے والا ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ مرکز "خدا و رسول کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۸)

بالفاظِ دیگر، نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد خلیفۂ اول (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے فیصلوں کی اطاعت، اُمت کے لئے "خدا و رسول" کی اطاعت کے قائم مقام تھی۔ مفتی صاحب (اور ان کے ہم نوا "علما حضرات") کے نزدیک ایسا کہنے والا کافر ہے۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ عقیدہ "ملتِ اسلامیہ کے مسلمہ عقیدہ" کے خلاف ہےؔ۔

میں نے اپنی کتاب، معارف القرآن جلد چہارم ــ معراجِ انسانیت ــ اور دیگر مقامات میں قرآن کریم کی متعدد آیات پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ "اللہ اور رسول" سے مراد، اسلامی نظام حکومت ہے۔ (مثلاً) سورۂ انفال کی پہلی آیت:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (۸)

لوگ تجھ سے مالِ غنیمت (انفال) کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ مالِ غنیمت "اللہ اور رسول" کا ہے۔

ؔ یہ حضرات اپنے ہر عقیدہ کو "امت کا مسلمہ عقیدہ" کہہ کر پیش کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ (قرنِ اول کے بعد) کوئی ایک عقیدہ بھی ایسا نہیں جسے ساری اُمت کا متفق علیہ مسلمہ عقیدہ کہہ کر پیش کیا جا سکے۔

میں نے لکھا ہے کہ اس میں "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے۔ اب دیکھئے کہ اس ضمن میں، خود ان حضرات کے مفسرین کیا کہتے ہیں۔ امام ابن جریر طبریؒ (جن کی تفسیر کو ام التفاسیر کہا جاتا ہے) "اللہ اور رسول" کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

واولیٰ ھذہ الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال ھی زیادات یزیدھا الامام بعض الجیش او جمیعھم

انفال کے معانی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

دیکھئے۔ یہاں امام طبریؒ نے "اللہ اور رسول" کی تفسیر "امام وقت" سے کی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اس آیت کے متعلق (ترجمان القرآن میں) لکھتے ہیں۔

مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جس شخص کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اس کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

لیکن قرآن نے یہ حکم دے کر کہ مالِ غنیمت میں جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے، نہ کہ لوٹنے والوں کا' سپاہیوں کی ذاتی طمع و حرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔

دیکھئے: یہاں انہوں نے "اللہ اور رسول" کے معنی حکومت (یعنی اسٹیٹ) کئے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، اپنی تفسیر (تفہیم القرآن۔ جلد دوم) میں' اس آیت کے نیچے لکھتے ہیں۔

قرآن نے انفال کو "اللہ اور رسول" کا مال قرار دے کر پہلے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ تمام مالِ غنیمت لاکر بے کم و کاست' امام کے سامنے رکھ دیا جائے۔

(ب) اسی سورہ میں' ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى ...... (۸/۴۱)

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مالِ غنیمت میں ملے' اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے۔ رسول کیلئے۔ قرابت داروں کے لئے ...... ہے۔

مولانا آزاد (مرحوم) اس آیت کے نیچے لکھتے ہیں

سورت کے ابتدا میں فرمایا تھا کہ مالِ غنیمت "اللہ اور اس کے رسول" کا ہے۔ یعنی حکومت کا ہے۔ اب آیت (۴۱) میں اس کی تقسیم کا طریقہ بتلا دیا۔ "اللہ اور اس کے رسول" کے حصہ سے مقصود یہ ہے کہ دین و ملت کے مصالح کے لئے ایک خاص رقم رکھی جائے۔ اس میں سے پیغمبرِ اسلام کو جب تک زندہ رہیں، ضروری مصارف ملیں۔ ان کے بعد ائمہ مسلمین کو۔

مودودی صاحب اس آیت کے تابع لکھتے ہیں کہ "اس تقسیم میں اللہ اور رسول کا حصہ ایک ہی ہے۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ خمس کا ایک جزء اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اقامتِ دینِ حق کے کام میں صرف کیا جائے" (تفہیم القرآن۔ جلد دوم) جہاں تک لذی القربیٰ (رشتہ داروں) کا تعلق ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک گروہ کی رائے ہے کہ

حضورؐ کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضورؐ کی جگہ خلافت کی خدمات سرانجام دے۔ (ایضاً)

کیا مفتی صاحب فرمائیں گے کہ ان حضرات کے متعلق ان کا فتویٰ کیا ہے، کیونکہ یہ حرفاً حرفاً وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو اس "کافر" نے کہا ہے!

(ب) میں نے دوسری آیت سورۃ المائدہ کی لکھی ہے۔ یعنی

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا........ (۵/۳۳)

ان لوگوں کی سزا، جو "اللہ اور اس کے رسول" کے خلاف جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں فساد پیدا کرتے ہیں یہ ہے کہ........

اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا کہ "اللہ اور اس کے رسول" کے خلاف جنگ کرنے سے مراد، اسلامی نظام (حکومت) کے خلاف جنگ کرنا ہے اور سزا کے معاملہ میں حکومت کو اختیار دیا گیا ہے۔ امام رازیؒ نے اس آیت کے تحت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابوحنیفہ اذا قتل و اخذ المال فالامام مخیر بین ثلاثۃ اشیاء

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا چاہے اس کو دے۔

اسی آیت کی تفسیر میں، علامہ جلال الدین سیوطیؒ الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں۔

عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع به مایشاء

سعید ابن مسیب، حسن بصری اور ضحاک (علیہم الرحمۃ) نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے۔

نواب صدیق حسن خان مرحوم، فتح البیان میں لکھتے ہیں۔

قال ابن عباس سعید بن المسیب و مجاهد - وعطاء - والحسن البصری و ابراهیم النخعی - والضحاک - و ابوثور من شهر السلاح فی قبة الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر به و قدر علیه فامام المسلمین فیه الخیار

حضرت ابن عباس، سعید ابن المسیب، مجاہد - عطاء - حسن البصری - ابراہیم نخعی - ضحاک اور ابوثور (علیہم الرحمۃ) نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، اس آیت کے تحت، اپنی تفسیر (تفہیم القرآن جلد اول) میں لکھتے ہیں کہ

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا و رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو..... ایسا نظام جب کسی ملک میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی اور ڈکیتی کی حد تک ہو، یا بڑے پیمانے پر، اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لئے ہو، دراصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔..... یہ مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

کیا مفتی صاحب فرمائیں گے کہ ان حضرات کے متعلق ان کا کیا ارشاد ہے ـــــ یعنی ان حضرات کے متعلق جن میں مودودی صاحب

سے لے کر حضرت ابن عباسؓ جیسے صحابی تک شامل ہیں ۔۔۔ یہ بھی "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی حکومت لیتے ہیں! کیجئے ہمت، اور بڑھائیے اس فتویٰ کی نوک نشتر کو ذرا آگے! اور پھر ذرا ہٹ دھرمی اور سخن پروری کے جذبہ سے ہٹ کر غور کیجئے۔ کہ خلفت سے لے کر سلف تک اُمتِ محمدیہؐ کے نزدیک "اللہ اور رسول" سے وہی ۔۔۔ مفہوم ہے جسے میں نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے یا کچھ اور ہے؟

(۵) یہ ہیں ذات باری تعالیٰ اور "خدا و رسول" کے متعلق میرے عقائد جن کی بناء پر ان حضرات نے کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ میں نے اپنے سابقہ خط میں لکھا تھا کہ اگر مفتی صاحب اس پہلے نکتہ کے متعلق اعترافِ حقیقت کر لیں تو میں فتویٰ کی باقی ماندہ شقوں کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ ان میں بھی، اسی طرح، کس قدر کتمانِ تلبیس سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے پہلی ہی منزل میں جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ قارئین کے سامنے ہے۔ اگر وہ سچ سننے کی تاب رکھتے اور یوں راہِ فرار اختیار نہ کرتے تو میں انہیں بتاتا کہ "حجیت حدیث، سنت رسول اور اطاعتِ رسول" کے متعلق جو کچھ میرے خلاف کہا جاتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور جو کچھ میں فی الواقعہ کہتا ہوں قرآن کریم اس کی کس طرح تائید کرتا ہے، اور اس باب میں خود ان حضرات کے عقائد کیا ہیں۔ اُس وقت انہیں معلوم ہو جاتا کہ شیشے کے مکان میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینکنا کس قدر خطرناک ہوتا ہے! لیکن اس خطرہ کا احساس ہی تو ہے جس نے انہیں یوں فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے!

۶ ۔۔۔ مفتی صاحب نے حسبِ عادت، عوام کو اشتعال دلانے کے لئے پھر اس فقرہ کو دہرایا ہے کہ میں (معاذ اللہ) "سنت رسول اللہ کے سرمایہ کو عجمی سازش" کہتا ہوں۔ حالانکہ اگر انہیں ذرا بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا تو وہ میرے پہلے خط کا وہ فقرہ دہرا دیتے جس میں میں نے واضح کیا تھا کہ

> میں صرف ان وضعی روایات کو "عجمی سازش" سے تعبیر کرتا ہوں جن میں غیر اسلامی معتقدات و رسومات کو اسلام کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔

لیکن ایسا کرنے سے ان کا رچایا ہوا سارا ڈھونگ ہی ختم ہو جاتا!

۷ ۔۔۔ مفتی صاحب نے اپنے مشغلہ "کافر گری" کی خفت کو مٹانے کے لئے، میرے ایک مضمون میں سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

> تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہوتا رہا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے زمانہ کے مذہب میں تبدیل کر دیا جائے ..... الخ

اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

ہیں میں آپ نے تیرہ سو سال کی پوری امت محمدیہ کے اربوں مسلمانوں کو جن میں صلحاء۔ اولیاء
اور اتقیا بھی لاکھوں کی تعداد میں شامل ہیں، یک قلم اسلام سے خارج۔ قرآنی دین سے بے تعلق
اور جاہلیت کے مذہب کا پیرو قرار دے دیا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف گئے، اور اس سے کہا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے سے آزاد کر دے، تو اس نے یہ سوچ کر کہ اس شخص سے اس طرح عہدہ برا ہونا مشکل ہے، ایک گہری تدبیر سوچی۔ اس کے گرد و پیش مملکت کے اعیان و ارکان بیٹھے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے آبا و اجداد کے متعلق حضرت موسیٰؑ کا خیال کیا ہے۔ اس نے اصل سوال سے ہٹ کر حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۲۰/۵۱)۔ یعنی یہ بتاؤ کہ ہمارے جو بزرگ پہلے گزر چکے ہیں، ان کا کیا حال ہوگا؟ اس کی چال یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ نے جو نہی کچھ کہا وہ اہل دربار کو یہ کہہ کر بھڑکا دے گا کہ دیکھو! یہ شخص تمہارے بزرگوں کے شان میں کیا کہتا ہے!

مفتی صاحب نے اُمت کے لاکھوں "صلحاء۔ اولیاء اور اتقیاء" کی طرف اشارہ کرکے عوام کو اسی طرح بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ میں مفتی صاحب محترم کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

(۱) میں نے آج تک، امت کے ان لاکھوں نفوس میں سے کسی کے خلاف کبھی سوء ادبی کا کلمہ تک نہیں کہا ان کے نام ہمیشہ تکریمی الفاظ کے ساتھ لیتا ہوں۔

(۲) اگر ان میں سے کسی کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جاتی ہے جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہو، تو میں کہتا ہوں کہ ظن غالب یہی ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ یہ بات ان کی طرف غلط منسوب ہے۔

(۳) اور اگر کوئی شخص اس پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں، وہ بات انہوں نے ہی کہی تھی، تو میں یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا ہوں کہ آپ انہیں ایسا سمجھتے ہیں تو آپ مالک ہیں۔ میں انہیں ایسا نہیں سمجھتا۔ اور اگر آپ سنداً ایسا کہتے ہیں تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ان سے سہو ہو گیا۔ ہمارے پاس صحیح اور غلط کی کسوٹی خدا کی کتاب موجود ہے۔

یہ ہے میرا مسلک اسلافِ اُمت کے متعلق

(ب)۔ میرے جس مضمون سے مندرجہ بالا اقتباس لیا گیا ہے، اس میں میں نے بہت سے ایسے نظریات کو پیش کیا ہے جو اس وقت ہم میں مروج ہیں، لیکن جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اس سلسلہ کی آخری شق یہ ہے۔

قرآن کے ساتھ تشکیلِ اُمت کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ دنیا میں قومیں، جو در حقیقت
قبائل ہی کی پھیلی ہوئی شکلیں تھیں، نسل اور وطن کے اشتراک سے بنتی چلی آ رہی تھیں۔
قرآن نے کہا کہ امت کی تشکیل، اشتراکِ ایمان (IDEOLOGY) کی بنا پر ہوتی ہے

...... انسانیت کی تاریخ میں یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔
(سلیم کے نام - ۱۹۹۵ء ایڈیشن - صفحہ ۲۵۱)

اس کے بعد لکھا تھا۔

تم نے دیکھا سلیم! نبوت محمدیہ سے کس طرح انسان کی تاریخ دو حصوں میں بٹ چکی ہے اور قرآن کے ساتھ کس طرح انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن اس تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اس میں صرف ہوتا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے وملنے کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور آج جو اسلام دنیا میں مروج ہے وہ زمانۂ قبل از قرآن کا مذہب ہو تو ہو، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

میں محترم مفتی صاحب سے بادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ نسل اور وطن کی بنا پر قومیت کی تشکیل کا نظریہ قرآنی دین کا نظریہ ہے جسے محمد رسول اللہ نے پیش کیا تھا، یا زمانہ قبل از قرآن کے عہد جاہلیت کا نظریہ ہے؟

مجھے اس کا احساس ہے کہ جہاں تک "وطنیت" کا تعلق ہے، مفتی صاحب کو اس سوال کا جواب دینے میں گھبراہٹ ہوگی کیونکہ دیوبند کی بزرگ ہستی، مولانا حسین احمد مدنی مرحوم، نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" اور اسی پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

لیکن اگر مفتی صاحب، پاکستان کے تصور کو دل سے اپنا چکے ہیں، تو انہیں یہ کہنے میں باک نہیں ہونا چاہیے کہ نسل اور وطن کے اشتراک پر قومیت کی تشکیل کا نظریہ، زمانۂ جاہلیت کا تصور تھا۔ یہی میں نے کہا ہے۔

(ج)۔ یہ بات کہ ہمارے مروجہ اسلام میں، بکثرت عقائد و رسومات عہد جاہلیت کے شامل ہو گئے ہیں، میں نے ہی نہیں کہی۔ سنئے کہ اس باب میں خود انہی میں سے ایک صاحب کی تحقیق کے نتائج کیا ہیں؟ وہ اسلامی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد)

آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا۔ ملک عضوض نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس، اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد، جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے...... سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی

بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے۔ یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ سن لیجئے۔

جاہلی امارت کی مسند اور جاہل راہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا۔ جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا۔ جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشدین کر بیٹھنا، وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

سُن رہے ہیں آپ؟ آگے چلئے۔

جاہلیت خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا.....

جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کی ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لئے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اس قدر تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگانِ اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں، پرانے معبدوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔

اب ذرا جگر تھام کر بیٹھئے اور سنئے۔

اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستے سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر نصب کرنے میں پیش آ سکتی تھیں۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر، اسلام میں اولیاء پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی۔ مشرکانہ اعمال کے لئے اسلام کی اصطلاحی زبان میں سے الفاظ بہم پہنچائے اور اس نئی شریعت کے لئے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرک جلی کی تعریف میں نہ آ سکیں۔ اس فنی امداد کے بغیر، اسلام کے دائرہ میں شرک بے چارہ کہاں بار پا سکتا تھا؟

اس کے بعد سنئے کہ کیا ہوا؟

جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔

اتنا ہی کافی ہے یا کچھ اور بھی پیش کیا جائے؟ یہ "کافر پرویز" کے خیالات نہیں، یہ آپ کے طبقۂ علماء کے ایک جید نمائندہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا تجزیہ ہے جسے انہوں نے "تجدید و احیاءِ دین" کے عنوان سے آج سے قریب بیس اکیس سال پہلے پیش کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن۔ بابت دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء، صفحات ۲۸۵-۳۰۳)

(د) جس تعلیم سے آپ حضرات کو "علماء" ہونے کی سند مل جاتی ہے۔ اس میں کتنا حصّہ اسلام کا اور کتنا غیر اسلامی تعلیمات کا ہوتا ہے، اس کے متعلق سنئے کہ سرخیل طبقۂ علماء مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، کس نتیجہ پر پہنچے تھے وہ اپنی مشہور تصنیف تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

مدّتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمّتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کا انہی سے ظہور و نمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصل و اساسِ علومِ شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیاوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصّہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ الخالص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت اور عجمیت سے۔ کوئی شے اس سے نہ بچی حتیٰ کہ علماً علوم البلاغت و بلاغت و بیان۔ اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیر ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے، تو پھر ان اساطیر داوہام کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقبِ شریعت "معقولات" پکارا جاتا ہے۔

(س) محترم مفتی صاحب کو اس پر بہت غصہ آگیا ہے کہ میں نے (معاذ اللہ) اولیاء، و صلحائے امت کی شان میں (ان کے عائد کردہ بے بنیاد الزام کے مطابق) سوءِ ادبی کی ہے۔ اگر جرأت عرض معاف ہو تو میں جناب محترم سے ایک چھوٹی سی بات دریافت کر لوں؟ آپ نے بڑے فخر سے لکھا ہے کہ میرے خلاف فتویٰ عائد کرنے والوں میں "ہر مکتبِ فکر کے علمائے دین۔ دیوبندی۔ بریلوی۔ اہلحدیث، سنی و شیعہ" سب شامل ہیں۔ آپ ان میں سے سب سے پہلے "دو بڑے فرقوں ـــــ شیعہ اور سنی ـــــ کو لیجئے۔

(۱) شیعہ حضرات، خلفائے راشدینؓ میں سے پہلے تین خلفاء کے متعلق، صحابہ کبارؓ میں سے (باستثنائے چند)

سب کے متعلق - اور اُن زمانے سے لے کر آج تک کے تمام سُنّی مسلمانوں کے متعلق، جو عقائد رکھتے ہیں، وہ آپ کے علم میں ہیں؛ میں انہیں دُہرانا نہیں چاہتا۔ ان عقائد کی رُو سے؛ یہاں سے لے کر وہاں تک، پوری کی پوری (غیر شیعہ) اُمّت اور اس کے اولیاء، صلحاء، اتقیاء، حتّٰی کہ صحابہ کبارؓ کی جو پوزیشن قائم ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۲) دوسری طرف، ان لوگوں کے متعلق، جو خلافت حضرت صدیق اکبرؓ کو برحق نہیں مانتے، سنّیوں کا جو فیصلہ ہے وہ بھی آپ کے علم میں ہے۔ اس فیصلہ کی رُو سے یہاں سے لے کر وہاں تک، شیعہ حضرات اور ان کے ائمہ کبارؒ کی جو پوزیشن قائم ہوتی ہے وہ ظاہر ہے

(۳) خود سنّیوں میں سے غیر مقلد (اہلِ حدیث) آپ مقلدین کے متعلق جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی آپ کے علم میں ہے - اس عقیدہ کی رُو سے اُمّت کے تمام مقلد مسلمانوں اور ائمہ فقہ (بشمول امام اعظم ابو حنیفہؒ) جس مقام میں کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کا بھی آپ کو علم ہے۔

(۴) اور مقلدین، غیر مقلدوں کی نسبت جو عقیدہ رکھتے ہیں، اس کی رُو سے پوری اُمّت کے اہلحدیث حضرات مع ان کے ائمہ کرامؒ کے جس جگہ پہنچا دیئے جاتے ہیں، اسے آپ بخوبی جانتے ہیں۔

(۵) مقلدین میں سے، دیوبندی حضرات، بریلوی حضرات کے متعلق - اور بریلوی حضرات دیوبندی حضرات کے متعلق جو عقیدہ رکھتے ہیں اس کا بھی آپ کو علم ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے، ان دونوں جماعتوں کے اسلافؒ جس سمت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اس کے متعلق (کم از کم مجھے تو) لب کشائی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

یہ وہ حضرات ہیں جن کے برملا عقائد کی رُو سے، یہاں سے وہاں تک، تمام اُمّت بہ حیثیت مجموعی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتی ہے ـــــ اس پر ان تمام فرقوں کے ایک دوسرے کے خلاف فتاویٰ شاہد ہیں ـــــ اور اس میں اُمّت کے مختلف فرقوں کے تمام اولیاء، صلحاء، اتقیاء ـــــ حتّٰی کہ صحابہ کبارؓ تک بھی آ جاتے ہیں ـــــ

یہ تمام حضرات، آپ کے نزدیک نہ صرف مسلمان ہیں، بلکہ "علمائے دین" کی فہرست میں شامل اور دوسروں کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرنے کے مجاز۔ لیکن جو شخص صرف اتنا کہتا ہے کہ قرنِ اول کے بعد، مسلمانوں نے اسلام میں وہ کچھ داخل کر لیا، جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، وہ آپ کے نزدیک ملحد، بے دین اور کافر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ کونسی مصلحت ہے جس کے پیشِ نظر آپ کی حمیتِ دینی ان لوگوں کے خلاف تو جوش میں نہیں آتی جو (اپنے سوا) اُمّت کے تمام اربوں مسلمانوں کو، مع ان کے جملہ اسلاف کرامؒ کے (معاذ اللہ، معاذ اللہ) کافر اور مرتد قرار دیتے ہیں، اور اگر اس کا مظاہرہ ہوتا ہے تو صرف پرویز کے خلاف! یہ کیوں ہے کہ

لالہ ساغر گیر و نرگس مست، و بر ما نامِ فسق!

(س) لیکن دوسروں کی باتیں چھوڑ کر، قبلہ مفتی صاحب خود اپنی کیفیت پر کیوں نہ غور فرمائیں؟ آپ کا یہ عقیدہ ہے ناں کہ مسلمانوں میں تہتر فرقے ہوں گے، ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہوگا - باقی سب گمراہ اور جہنمی ہوں گے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک ناجی فرقہ حنفیہ دیوبندی ہی ہو سکتا ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ اُس ایک فرقہ کے علاوہ جسے آپ ناجی تصور کرتے ہیں، امت میں، گذشتہ تیرہ سو سال میں جس قدر مسلمان گزرے ہیں اور وہ بزرگ جنہیں وہ اولیاء، اصلحا اور اتقیا مانتے ہیں، رسول اللہ کے لائے ہوئے اسلام پر تھے یا کسی اور طریقہ کے متبع؟ ظاہر ہے کہ آپ انہیں کسی اور دین کے متبع مانتے ہیں، جبھی تو انہیں گمراہ اور جہنمی قرار دیتے ہیں۔ سو جس شخص کی اپنی حالت یہ ہو کہ وہ اپنے فرقے کے علاوہ، تمام مسلمانوں کو جہنمی سمجھتا ہو، اُسے یہ کیسے زیب دیتا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو مطعون کرے جو یہ کہتا ہو کہ اسلام میں بہت سی چیزیں خلافِ اسلام داخل ہو گئی ہیں؟

اگر آپ میں سچ سننے کی تاب ہوتی تو میں آپ کو بتاتا کہ جو باتیں آج ہم میں اسلام کے نام سے مروّج ہیں، ان کا کتنا حصّہ اسلامی ہے اور کتنا غیر اسلامی، اور وہ غیر اسلامی حصّہ کہاں کہاں سے آیا اور کس طرح اسلام میں داخل ہو گیا۔ لیکن آپ اسے کس طرح سُن سکتے ہیں؟ اپنے سامنے اپنا مکان ڈھتے کون دیکھ سکتا ہے؟ اس کیلئے

جینے کا حسِ جگر چاہیئے شاہیں کا کلیجہ

(۸) — مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ

ایک فرد "پرویز صاحب" کی تکفیر سے تو آپ کے نزدیک امت میں زلزلہ آگیا اور ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا مگر پوری امت کی تکفیر و تفسیق سے اسلام اور امتِ اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

سب سے پہلے تو یہ گذارش ہے کہ آپ کا یہ فتویٰ ایک فرد "پرویز صاحب" کے خلاف نہیں، ان تمام لاکھوں مسلمانوں کے خلاف ہے جو اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ حضرات بیشک اپنے ارادت مندوں کے حلقہ میں یہی کہتے ہوں گے کہ یہ ایک لرزہ انگیز کارنامہ ہے جو آپ حضرات کی طرف سے ظہور میں آیا ہے۔ لیکن ان حلقوں سے باہر نکل کر سنئے تو سہی کہ ....

کہتی ہے تم کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے، وہ اس لئے نہیں کہا کہ یہ فتویٰ میرے خلاف لگایا گیا ہے۔ اگر آپ کسی اور کے خلاف بھی یہ حرکت کرتے تو اس وقت بھی میرا ردِّعمل یہی ہوتا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ شدید۔ اس لئے کہ اس وقت میری ذات کا سوال درمیان میں نہ آتا۔ جو چیز میرے لئے وجہ جگر سوزی ہے وہ یہ ہے کہ آپ حضرات کی اس قسم کی حرکات سے،

امت بیچاری غیروں کی نظروں میں ایک تمسخر بن جاتی ہے۔ آپ جس مقام پر کھڑے اس قسم کے مشغلوں میں مصروف ہیں، دوسری قومیں اسے صدیوں پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔ اس سلسلہ میں، میں آپ کی توجہ مودودی صاحب کے ان الفاظ کی طرف پھر مبذول کرانا چاہتا ہوں جنہیں میں نے اپنے سابقہ خط کے اخیر پر درج کیا تھا۔ آپ ان الفاظ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اس قسم کی حرکات نے آپ حضرات کو اور آپ کی وجہ سے سارے مسلمانوں کو کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ آپ حضرات (یعنی مختلف فرقوں کے "علمائے کرام") نے ایک ایک کر کے ساری امت کو کافر قرار دے رکھا ہے اور آپ کی طرف سے شائع کردہ فتووں کی رو سے، روئے زمین پر ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہتا۔۔۔ مع ان تمام علمائے کرام کے جنہوں نے موجودہ فتویٰ شائع کیا ہے! کیا یہ امر موجب ہزار تاسف نہیں! لیکن موجب تاسف تو اس کے لئے ہو جو سینہ میں ملت کے لئے قلب حساس رکھتا ہو!

(۹) آخر میں محترم مفتی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

> آپ کے مکتوب کے فقرہ ۸ میں جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس سطح پر آ کر آپ نے گفتگو شروع کی ہے۔ اور جو زبان بولنا اختیار کیا ہے، اس کے پیشِ نظر اس رجحان کو مزید تقویت ہوئی کہ اس جواب کو اپنی جانب سے آخری تصور کروں اور آپ سے درخواست کروں کہ مجھے مزید مراسلت کی زحمت گوارا نہ کریں۔ نہ مجھ سے آئندہ کسی مراسلت کے جواب کی توقع کریں۔

میرا سابقہ خط گذشتہ صفحات میں موجود ہے۔ قارئین اس کے پیراء ۸ کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ اور فیصلہ کریں کہ کیا اس میں کوئی بات ایسی ہے جس سے وہ اثر لیا جا سکے جس کا اظہار مفتی صاحب نے اوپر فرمایا ہے؟ اگر محترم مفتی صاحب اس فرار کے لئے کوئی اور وجہ بیان کر دیتے تو شاید کسی حد تک بات بن جاتی۔ جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے اس سے انہوں نے ارباب بصیرت کی نگاہوں میں اپنی پوزیشن کو بہت گرا لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مشیر اچھے نہیں ہیں۔

اگر مفتی صاحب نے لب و لہجہ کی سختی اور گفتگو کی سطح کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو وہ کسی وقت اپنے شائع کردہ فتویٰ کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں اور پھر دیکھیں کہ کوئی گالی ایسی ہے جو اس میں استعمال نہ کی گئی ہو؟ اور یہ چیز کچھ غیر متوقع نہیں۔ اس لئے کہ، خود انہی کے ایک نمائندہ کا فیصلہ ہے کہ

> باستثنائے چند اس طبقہ (علماء) کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانئے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہو گی۔ اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص

(بنا) ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کرسکتا۔

(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۵۰- ۳۵۹ از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

(۱۰) — اگر قارئین ذرا بنظرِ تعمق دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس مصیبت کی اصل وجہ کیا ہے جس سے یہ حضرات خود بھی اس قدر ضیق میں رہتے ہیں اور قوم کو بھی پریشانی میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ بدقسمتی سے یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو شخص علومِ شریعت کی کچھ واقفیت حاصل کرلے، اسے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں، خصوصی حقوق اور اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ جو شخص ان کے ان (خود فرض کردہ) حقوق اختیارات کو تسلیم کرے، وہ ان کے نزدیک پکا اور سچا مسلمان ہوتا ہے۔ جو انہیں تسلیم نہ کرے، وہ دین کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے اس سے انہیں سخت غصہ آجاتا ہے۔ یہ ان کی ایک دوسرے کے خلاف باہمی جنگ وجدال اور فتویٰ بازی ان کے اسی غم وغصے کے مظاہرات ہوتے ہیں۔ جو شخص ان کے ان حقوق واختیارات کے متعلق کچھ نہیں کہتا، یہ اس کے خلاف کبھی لب کشائی نہیں کرتے، خواہ وہ عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی بے دین اور اعمال کے اعتبار سے کیسا ہی فاسق وفاجر کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم جس مذہبی پیشوائیت کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا وہ، انہی خصوصی حقوق و اختیارات کا تصور تھا۔

قرآن کی رُو سے امت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق چلانے کے اختیارات صرف اسلامی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں۔ وہی مسلم اور غیر مسلم کے حدود وامتیاز مقرر کرتی ہے۔ وہ اپنے اختیارات میں سے کچھ اپنے افسرانِ ماتحت (اولوا الامر) کو تفویض کر دیتی ہے۔ قاضی۔ مفتی۔ وغیرہ، اسلامی حکومت کے افسرانِ ماتحت (یا منصب دار) ہوتے تھے۔ انہی کو یہ اختیارات دیئے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اپنے آپ کو ان اختیارات کا مالک نہیں سمجھتا تھا۔ اُس وقت اُن حضرات کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ (مثلاً) جب گورنر کوفہ نے امام ابو حنیفہؒ کو فتویٰ دینے سے منع کر دیا تو

> ایک دن آپ گھر میں بیٹھے تھے۔ ان کی لڑکی نے پوچھا کہ میں آج روزہ سے ہوں۔ دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی رہا ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جان پدر! اپنے بھائی حماد سے پوچھ۔ میں افتاء سے منع کر دیا گیا ہوں۔
>
> (سیرۃ النعمان۔ علامہ شبلی۔ صفحہ ۹۳)

حضرت امام اعظمؒ کی احتیاط کا تو یہ عالم تھا۔ اور اب ان کے نام لیواؤں کی یہ حالت ہے کہ نہ اسلامی حکومت ہے اور

نہ یہ اس کے مناصب دار ہیں۔ نہ انہیں کسی نے کوئی اختیارات تفویض کئے ہیں، نہ اقتدارات۔ لیکن کیفیت ان کی یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو دوسروں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے کی اتھارٹی سمجھتے ہیں۔ یہ ہے وہ غلط فہمی جس میں یہ حضرات بدقسمتی سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے۔ ساری اُمت ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہے۔ ان کے اس جذبہ کی

> تحرک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ۔ یا خود غرضی اور حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ بہرحال اس نے مسلمانوں کی جماعت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی لشکر نے نہیں پہنچایا۔
>
> (سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۱۴۱)

مسلمانوں کی جماعت کو اس نقصان عظیم سے بچانے کا خیال تھا جس کی وجہ سے میں نے مفتی صاحب سے اس خط و کتابت کو ضروری سمجھا تھا۔ ورنہ

میں جانتا تھا جو وہ لکھیں گے جواب میں

اور اس میں وہ معذور بھی ہیں۔

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

باقی رہا محترم مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ کسی بات کا جواب نہیں دیں گے سو انہیں شاید یاد نہیں رہا کہ ایک مقام ایسا بھی آنے والا ہے جہاں وہ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکیں گے کہ میں اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ وہاں تو کیفیت یہ ہوگی کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔

پرویز
۲۵ر اپریل ۱۹۶۳ء

بقیہ صفحہ ۱۳۶

کے ہاں یہ کہہ کر نہیں چھوٹ جائیں گے کہ میں نے شہاب اور ترجمان القرآن میں یوں پڑھا تھا۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷/۳۶)

۳۔ دیکھو! پرویز کیا کہتا ہے؟

لاہور کے ہفت روزہ ایشیا کی ۲۰ اپریل ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں

ناموس رسالت اور منکرین سنت

کے جلی عنوان کے تحت "مولانا گوہر رحمان۔ ہوتی مردان" کے نام سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کی پہلی سطر یہ ہے:۔

> فتنہ انکار سنت اور پرویزی مکتبہ فکر کے ماہنامہ "بلاغ القرآن" نے تحفظ ناموس رسالت کے پرفریب نام پر صحیح اور ثابت احادیث رسول کے خلاف ایک سلسلہ مضامین شروع کر رکھا ہے۔

اس کے بعد آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ مقالہ میں کیا لکھا ہوگا۔ لیکن آپ یہ معلوم کرکے حیران ہونگے کہ ماہنامہ "بلاغ القرآن" کو نہ طلوع اسلام سے کوئی تعلق ہے نہ پرویز صاحب سے کوئی واسطہ!

لیکن جب مقصد پرویز صاحب کو بدنام کرنا ٹھہرا تو پھر سچ اور جھوٹ میں امتیاز کی کیا ضرورت؟ اگر ہمارے ہاں کی مقدس صحافت کے یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں جب سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش کی عبارات نقل کرکے، لکھا جائیگا کہ دیکھو! پرویز کیا کہتا ہے؟ چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

شکریہ و معذرت

طلوع اسلام کنونشن کی تصاویر بالعموم محترم یوسف ضیاء صاحب کے ذوق و کاوش کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کے لئے ہم ان کے شروع سے شکر گذار چلے آتے ہیں۔ اس دفعہ انھوں نے جو تصاویر لیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جو طلوع اسلام میں چھپ سکتی تھیں اور بعض ایسی جو سلائیڈ کے ذریعے پردۂ سیمیں پر دکھائی جا سکتی ہیں۔ اتفاق سے مختلف بزموں کی تصاویر سلائیڈ پر آئی ہیں جس کی وجہ سے وہ طلوع اسلام میں شائع نہیں ہو رہیں۔ اس لئے ہم متعلقہ بزموں سے معذرت خواہ ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ تصویریں بلاک میں منتقل ہو سکیں، تو انھیں کسی آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا۔ ورنہ وہ تمام سلائیڈ آئندہ کنونشن میں دکھائی جا سکیں گی۔

بقیہ رپورٹ ۷۲ء کے بعد

مطبوعات

پرویز صاحب کی کتابوں اور ادارہ کی دیگر مطبوعات کی طباعت و اشاعت کا کام اب میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے سپرد ہے اور میزان کے زیرِ اہتمام یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے جاری ہے۔ جہاں تک طباعت و اشاعت کا تعلق ہے ادارہ کی ذمہ داری اب صرف ماہنامہ "طلوعِ اسلام" تک محدود ہے۔

احباب کو بخوبی معلوم ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا انحصار کس حد تک طلوعِ اسلام اور اس کی اشاعت پر ہے۔ لیکن مجھے بصد افسوس یہ عرض کرنے دیجئے کہ اپنے اس ترجمان کی اشاعت بڑھانے کے سلسلے میں بزموں کا چندہ بہ عمل بڑا مایوس کن ثابت ہوا ہے اور ادارہ بجا طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ مخالفت کے طوفان میں یہ صرف بزمِ کراچی کی منظم اور جاندار مہم ہے جس نے طلوعِ اسلام کی اشاعت کو سہارا دے رکھا ہے اور اگر دیگر بزموں کی طرح اس بزم کی تگ و تاز کمزور پڑ جائے تو پھر لامحالہ قرآنی فکر کے اس نقیب کا مستقبل ایک خطرۂ عظیم سے دوچار ہو جائے گا۔

طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی مالی معاونت قبول نہیں کی۔ اور وہ مسلسل جن مالی خساروں کو برداشت کرتا چلا آرہا ہے اس کا ذکر بھی کبھی مناسب نہیں سمجھا گیا۔ نہ ہی اس وقت یہ تذکرہ اس مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے۔ مقصد آپ حضرات پر یہ واضح کرنا ہے کہ اگر آپ کی بے اعتنائی کی یہی کیفیت رہی اور طلوعِ اسلام کی اشاعت کا یہی حال رہا تو پھر دعوتِ قرآنی کی تحریک پر اس کا کس قدر مضر اثر پڑے گا۔ اور ادارے کو کیسی تشویشناک صورتِ حال کا سامنا کرنا ہوگا۔

ادارہ سے متعلق ضروری کوائف آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ ان پر کماحقہٗ غور فرمائیں۔ ان معاملات سے آپ کا گہرا تعلق ہے۔ زندگی کے ایک مقدس ترین مشن کی بجا آوری کے لئے آپ سب ادارہ کے ہمنوا و ہم سفر ہیں۔ اور رفاقت کا یہ سلسلہ مستقبل کی طویل منزلوں تک پھیلا ہوا ہے یعنی یہ رابطہ باہمی عمرِ طبیعی زندگی تک موقوف نہیں بلکہ اس کی وسعتیں اس سے کہیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے آیئے مستقبل کی شاہراہ پر قدم بڑھاتے ہوئے اپنے عزائم میں ایک نئی حرارت پیدا کریں اور قرآنی تصورات کی بازآفرینیوں کی خاطر اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لے آئیں۔ مبارک ہیں آپ جنہوں نے اس مقصدِ عظیم کے لئے بطیبِ خاطر اپنے آپ کو وقف کیا ہے۔ والسلام